اشاعتِ خاص

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

۲۱ — ۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء



پاکستان پیپلز پارٹی کا ایک سال

(عوام کی نظر میں)



قیمت : ——— ۷۵ پیسے
ہوائی ڈاک سے : ——— ایک روپیہ



ANWAR SAMI.72

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ الفتح کراچی

مدیر
وہاب صدیقی

۲۱ - ۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء

قیمت : ——— ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے : ——— ایک روپیہ

جلد - ۳ شمارہ :- ۳۲

اداریہ

آزمائش اور چیلنج کا سال

۲۰ دسمبر ۱۹۷۲ء کو پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنے دور اقتدار کا قیمتی سال مکمل کر لیا ہے۔ یحییٰ خان نے جن حالات میں آدھا ملک صدر بھٹو کے حوالے کیا تھا، وہ حالات پوری قوم کے لئے بڑی آزمائش اور پیپلز پارٹی کے لئے بہت بڑا چیلنج تھے۔ بین الاقوامی، قومی اور صوبائی سطح کے انتہائی نازک مسائل تھے۔ انہیں غلط طور پر نمٹنے کا کوئی بھی اقدام مغربی پاکستان کے وجود کے لئے خطرہ بن سکتا تھا اور بن سکتا ہے۔

بین الاقوامی سطح پر "بنگلہ دیش" کا قیام، جنگی قیدیوں کی واپسی، دو بڑی طاقتوں امریکہ اور روس سے تعلقات، بھارت سے تعلقات، غیر ملکی امداد اور اسلحہ کی فراہمی جیسے سنگین مسائل قوم کو ورثے میں ملے۔ قومی سطح پر ایک شکست خوردہ قوم کے مورال (حوصلے) کو بلند کرنا، وطن دشمن طاقتوں اور اکھنڈ بھارت کے حامیوں سے نمٹنا، معاشی ضروریات کو پورا کرنا اور مختلف طبقات کے مسائل کو حل کرنا انتہائی اہم تھا۔ صوبائی سطح پر دو صوبوں میں نیپ کے اقتدار کا مسئلہ سر فہرست تھا کیونکہ اس پارٹی کو دو صوبوں میں جمعیت العلمائے اسلام کے ساتھ اتحاد سے اکثریت حاصل ہو گئی تھی لیکن مرکز میں ان کی تعداد بہت کم تھی۔ اس طرح صوبوں اور مرکز میں تعلقات کی نوعیت طے کرنا اس لئے زیادہ مشکل تھا کہ دو متضاد منشور ٹکرا رہے تھے۔

صدر بھٹو نے اقتدار سنبھالتے ہی مزدوروں، کسانوں، طالب علموں اور محروم طبقات کی برتری کو تسلیم کیا۔ اُن کا رویہ ان طبقوں کے بارے میں ہمدردانہ اور سرمایہ داروں کے ساتھ سخت تھا۔ انہوں نے مزدوروں کی بحالی کے احکامات جاری کئے۔ سرمایہ داروں سے زر مبادلہ جمع کرانے کا حکم دیا۔ بنیادی صنعتوں میں سے بعض سرکاری تحویل میں لے لی گئیں۔ گرفتار شدہ مزدور کارکنوں، طالب علموں اور سیاسی کارکنوں کو رہا کر دیا گیا۔ زرعی، تعلیمی، اور مزدوروں سے متعلق اصلاحات کا اعلان کیا۔

ان تمام کارروائیوں کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ملک میں عوام کی نمائندہ حکومت برسر اقتدار ہے اور اُن کی فلاح و بہبود کے لئے سرگرم عمل ہے مگر نتائج اس کے برعکس نکلنے لگے۔ سرمایہ داروں کی اکثریت نے برطرف کئے جانے

خاص مضامین

سرورق :- انور سمیع

فون :- ۴۱۲۲۷۴

ارشاد راؤ پبلشر نے حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد سے چھپوا کر دفتر ہفت روزہ الفتح - ۸۷ ڈی، نرسری کمرشل ایریا پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹ سے شائع کیا

والے مزدوروں، مزدور تحریک کے کارکنوں اور یونین کے عہدے داروں کو کام پر واپس لینے سے انکار کر دیا۔ مرکزی وزیروں، مشیروں اور صوبائی مشیروں اور گورنروں کی تمام ہدایات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ مالکان نے کارخانوں میں خام مال کی فراہمی بند کر دی۔ جزوی تالہ بندی، مکمل تالہ بندی، چھانٹیوں اور برطرفیوں کا بازار گرم کیا جاتا رہا۔ نوکر شاہی نے سرمایہ داروں کا ساتھ دیا۔ پیپلز پارٹی اس محاذ پر منہ دیکھتی رہی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس پارٹی کی قیادت نے پارٹی کی تنظیم کی جانب توجہ نہ دی۔ اس کے پاس اُن افراد کی کمی پیدا کر دی گئی تھی جو مختلف شعبہ ہائے زندگی میں مہارت رکھتے ہیں اور کاروبارِ حکومت چلا سکیں۔ تمام اہم عہدوں پر یا تو اُن جاگیرداروں کو فائز کر دیا گیا جو ایوب خاں حکومت کے ستون رہ چکے تھے یا ان سے متاثر تھے۔ نوکر شاہی کے کھنڈرات میں از سرِ نو روح پھونکی گئی اور بدنام ترین افسروں کو مختلف شعبوں کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔ اچھی انگریزی، اچھا سوٹ بوٹ اور آکسفورڈ یا ہارورڈ کی سند کو بھی مقام مِلا اور انہیں پالیسی ساز منصب سونپے گئے۔ یہی اندرونی محاذ پر اس پارٹی کی عدم مقبولیت اور عوام کی صفوں میں جارحانہ تنقید کا موجب ٹھہری۔ ایک سال یقیناً بہت کم مدت ہے مگر اس عرصے میں اربابِ اختیار، وزیرانِ باتدبیر اور مشیران نے کیا کچھ نہیں بنا لیا۔ معمولی سا ایم۔ پی۔ اے لکھ پتی بن چکا ہے اور جو پہلے صاحبِ حیثیت تھے، انہوں نے فن کارانہ مہارت سے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کی ہے۔

صدر بھٹو، اپنی پارٹی کا ایک سالہ دور اس انداز میں منائیں کہ وزیروں اور ایم۔ پی۔ اے اور ایم۔ این۔ اے حضرات کے اثاثوں کی جانچ پڑتال کروائیں اور دیکھیں کہ کون کیا سے کیا ہو گیا ہے اور مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ ہر آدمی عوامی حکومت پر انگلیاں اٹھا رہا ہے کہ اتنا مہنگا جینا تو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔

اصلاحات میں صرف تعلیمی اصلاحات کسی حد تک قابلِ تعریف ہیں ہرچند کہ صوبہ سندھ میں وزیرِ تعلیم کی صوابدید پر رہا ہے کہ وہ جس ادارہ کو چاہیں، قومیانے سے بچالیں۔ اس کے باوجود اس کے اثرات ہماری قومی زندگی پر مرتب ہوں گے۔ زرعی اصلاحات کا کیا فائدہ ہوگا۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ رشوت لی جا رہی ہے اور زمین دی جا رہی ہے۔ ویسے ہی یہ اصلاحات اثر انداز نہیں ہوں گی۔

لیبر اصلاحات بکواس ثابت ہوئی ہیں۔ مزدوروں نے بڑا قیمتی خون دیا ہے۔ یہ اصلاحات انتہائی ناقص اور فضول رہیں۔ ان میں رد و بدل کی اطلاعات ملی ہیں لیکن اس سے بھی مزدوروں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

پریس کی آزادی کا یہ حشر ہے کہ حکومت تنقید برداشت نہیں کر سکتی۔ الفتح وزارتِ اطلاعات کی اس مشق کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ سرکاری اشتہارات بند کر دیئے گئے۔ آڈٹ کے لئے کاغذات منگوائے جاتے ہیں اور اُن دنوں کے حسابات پیش کرنے کے لئے کہا جاتا ہے جب جنگ زوروں پر تھی۔ مواصلات کی تمام سہولتیں مفقود تھیں۔ اس کے مقابلے میں ہر وہ اخبار جو "واہ واہ" کرتا ہے اُسے ہر طرح سے نوازا جا رہا ہے۔ نوائے وقت اور جنگ نے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔ اس میدان میں اب صرف الفتح ہی "چراغِ دمِ سحری" کی مانند ٹمٹما رہا ہے۔ اِسے بجھانے کا عمل جاری ہے۔ دیکھیے کب آخری وار ہوتا ہے۔

جی ہاں، یہ اُس الفتح کی آپ بیتی ہے، جس کے بارے میں صدر بھٹو لاکھوں کے اجتماع میں اعلان کرتے تھے، "ہم نے الفتح کھولا، ہم نے مساوات کھولا"۔ آج سچ لکھنے کی پاداش میں اُسے مجرموں کی صف میں کھڑا کر دیا گیا ہے۔ الفتح کا یہ سال حق، اور صداقت کا علمبردار رہا ہے اور آزمائش اور چیلنج کا سال ثابت ہوا ہے۔

سو، جہاں پریس کا گلہ گھونٹ دیا گیا ہے، وہاں اب سب اچھا ہی نظر آتا ہے۔ مگر اندر سے سب کھوکھلا ہو رہا ہے۔

بین الاقوامی سطح پر فوجوں کی واپسی صدر بھٹو کی بڑی کامیابی ہے مگر بنگلہ دیش کے بارے میں نامناسب وقت پر تسلیم کرنے کے اعلانات نے نقصان پہنچانا شروع کر دیا ہے۔ شاید یہ روس اور امریکہ کے دباؤ کا نتیجہ تھا، بہرحال اس سمت میں خارجہ پالیسی کا جھکاؤ ایک بہت بڑے المیے کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتا ہے، جسے مورخ قلمبند کرتے وقت کسی قسم کی رورعایت سے کام نہیں لے گا۔

صوبوں کی سطح پر نیپ، جمعیت اور پیپلز پارٹی کے بین الصوبائی اتحاد میں پیپلز پارٹی کو کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ چاروں صوبوں میں جاگیردار اور سرمایہ دار طبقوں نے محروم طبقات کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا ہے اور انہیں اپنی ہوس کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ سرحد اور بلوچستان میں کسانوں کے قتلِ عام اور پنجاب اور سندھ میں مزدوروں کے خون کی ارزانی سیاسی اتحاد کی عکاسی کر رہی ہے۔

المختصر پاکستان پیپلز پارٹی نے ایک سال کی مدت میں عوام کی طاقت پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ نوکر شاہی کو اعتماد میں لیا۔ پہلے سے پائی جانے والی بدعنوانیوں میں اضافہ ہوا ہے۔ پارٹی ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے عام آدمی کو نکال کر پیپلز پارٹی پر قبضہ کر لیا ہے۔



پیپلز پارٹی کی حکومت کا ایک سال ۔ ایک جائزہ

عوام کے نام پر ــــ عوام کا استحصال

وھاب صدیقی

۲۰ دسمبر ۱۹۷۲ء کو پاکستان پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت کا ایک سال مکمل ہوگیا۔ اس ایک سال میں پاکستان پیپلز پارٹی کی بیرونی اور اندرونی پالیسیوں میں تبدیلیاں ہوئیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی جو عوام کے کندھوں پر سوار ہو کر برسرِ اقتدار آئی تھی اور عوامی امنگوں اور خواہشات کی ترجمان سمجھی جاتی تھی، وڈیروں اور گماشتہ سرمایہ داروں کی محافظ بن گئی۔ عوام کی بجائے وڈیروں اور سرمایہ داروں کو طاقت کا سرچشمہ سمجھنے لگی۔ اس ایک سال نے پاکستان پیپلز پارٹی کو کنونشن لیگ بنتے دیکھا، مزدوروں کو جبریہ بے روزگاری اور گولیوں کا نشانہ بنتے دیکھا۔ محنت کش عوام اور طلبہ کو پابند سلاسل ہوتے دیکھا۔ کسانوں کی بیدخلیاں دیکھیں۔ غرض کہ پیپلز پارٹی کے دورِ اقتدار کے ایک سال میں وہی کچھ ہوا جو وطن عزیز کے قیام سے ہو رہا ہے۔

آیئے پاکستان پیپلز پارٹی کے ایک سالہ دورِ حکومت کا جائزہ لیں۔

صدر بھٹو، پنڈت جواہر لال نہرو سے بہت زیادہ متاثر ہیں، نہرو ان کا آئیڈیل ہے۔ ویسے مسٹر بھٹو اور مسٹر نہرو میں مماثلت بھی ہے۔ نہرو نے بھارتی عوام کو اپنی آواز پر جمع کرنے کے لئے کئی پلیٹ فارم استعمال کئے، ایک انقلابی کی حیثیت سے اپنے آغاز سے ہی اور اپنی ہنگامہ ساز زندگی کے آخر تک انہوں نے بھارت کے طول و عرض میں دور دراز دیہاتوں کا دورہ کیا۔ اور عوام کو اپنے فلسفے اور اپنے طرزِ زندگی میں ڈھالنے کے لئے زورِ خطابت دکھایا۔ عام آدمی نہرو پر اعتماد کرتا تھا۔ اسی اعتماد نے نہرو کو عظیم رہنما اور بھارت کا نجات دہندہ بنایا۔ اور یہ اعتماد اس حد تک جا پہنچا کہ نہرو عوام سے سفید سے سیاہ منوا سکتے تھے، نہرو نوجوانوں کا آئیڈیل اور دانشوروں کا پسندیدہ رہنما تھے۔ نہرو اپنے آپ کو سوشلسٹ کہتے تھے، اگر بغور دیکھا جائے تو صدر بھٹو نے شعوری یا غیر شعوری طور پر نہرو کی پیروی کی اور ان کی طرزِ سیاست کو اپنایا۔ نہرو، سیاست میں فوج کی مداخلت سخت ناپسند کرتے تھے، اس لئے انھوں نے فوج میں اتحاد پیدا نہیں ہونے دیا، جان بوجھ کر اپنی فوج کو ان گنت قوموں پر مشتمل رکھا، وزیر دفاع کرشنا مینن اور کمانڈر انچیف جنرل گو بند راتھیمّہ کے جھگڑے میں نہرو نے کرشنا مینن کا ساتھ دیا۔ اور کمانڈر انچیف کی ذلت آمیز رخصت کے اسباب پیدا کئے۔ اور پھر اس جھگڑے سے اپنا اقتدار مضبوط کیا، صدر بھٹو نے ۱۹۶۴ء میں نہرو کی اس پالیسی کو بھارتی فوج کے لئے باعثِ زیاں قرار دیا تھا۔ لیکن صدر بھٹو نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد فوراً فوج پر ضرب لگائی۔

صدر بھٹو نے اپنی پہلی نشری تقریر میں سات جنرلوں کی ریٹائرمنٹ کا اعلان کیا، جن میں کمانڈر انچیف جنرل آغا محمد یحییٰ خان، پاک فوج کے چیف آف اسٹاف جنرل عبدالحمید خان، قومی سلامتی کونسل کے سربراہ جنرل عمر، لیفٹیننٹ جنرل سید غلام محی الدین پیرزادہ، میجر جنرل خداداد خان، میجر جنرل کیانی اور جنرل اے او۔ مٹھا شامل تھے۔ صدر بھٹو نے لیفٹیننٹ جنرل گل حسن کو کمانڈر انچیف مقرر کرتے ہوئے کہا کہ "وہ پاک فوج کو از سرِ نو فعال خطوط پر منظم کریں گے۔ وہ سیاست میں ملوث ہونا پسند نہیں کرتے اور مجھے ان پر اعتماد ہے۔" گل حسن کو جنرل نہیں بنایا گیا۔ کہا گیا کہ "پاکستان ایک چھوٹا اور غریب ملک ہے وہ مزید ترقیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

۲۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو کموڈور حسن حفیظ احمد کو پاکستان نیوی کا کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا۔ اور وائس ایڈمرل مظفر حسن، ریئر ایڈمرل رشید احمد، ریئر ایڈمرل یو۔ اے۔ سعید، ریئر ایڈمرل ایم۔ اے۔ کے لودھی، کموڈور آر۔ اے ممتاز، کموڈور ایس احمد، میجر جنرل شوکت رضا، میجر جنرل خادم حسین اور میجر جنرل بی۔ ایم مصطفیٰ کو ریٹائر کر دیا گیا۔ صدر بھٹو نے اپنی پہلی نشری تقریر میں کہا تھا کہ "پاکستان مزید ترقیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔" لیکن ۲۸ دسمبر ۷۱ء کو کموڈور حسن حفیظ احمد کو ریئر ایڈمرل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی اور مارچ کے پہلے ہفتے میں انھیں مزید ترقی دے کر وائس ایڈمرل بنا دیا گیا۔ اب یہ اربابِ اقتدار ہی بتا سکتے ہیں کہ دو ماہ کے عرصے میں ہی پاکستان مزید ترقیوں کا کیسے متحمل ہو گیا۔

مارچ کے پہلے ہفتے میں پاک فضائیہ کے چھ اعلیٰ افسر ریٹائر کر دیئے گئے۔ لیفٹیننٹ جنرل گل حسن کی جگہ جنرل ٹکا خان کو پاک فوج کا سربراہ بنا دیا گیا۔ اور ایئر مارشل رحیم خان کی جگہ ایئر مارشل ظفر چوہدری کو پاک فضائیہ کا سربراہ بنا دیا گیا۔ گل حسن اور رحیم خان کی ریٹائرمنٹ کا اعلان کرتے ہوئے صدر بھٹو نے کہا کہ "یہ بونا پارٹ ازم کا شکار ہو گئے تھے، بونا پارٹ ازم کو ہرگز برداشت نہیں کیا جائے گا۔" یہ اعلان عوام کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دو ماہ قبل اقتدار

ایک سال میں پیپلز پارٹی کنونشن لیگ بن گئی

سنبھالتے وقت صدر بھٹو نے جس شخص پر اعتماد کا اظہار کیا تھا، وہ کس طرح بوناپارٹ ازم کا شکار ہو گیا۔ صدر بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی عوامی سیاست پر یقین رکھتی ہے۔ اور اس بات کی حامی ہے کہ عوام کو تمام حالات سے آگاہ رکھا جائے۔ لیکن پاک فوج میں جو تبدیلیاں کی گئیں۔ اس کے اسباب اور واقعات سے عوام کو بے خبر رکھا گیا۔

زرِ مبادلہ کی واپسی کیلئے اقدامات

صدر بھٹو نے غیر ممالک میں جمع زرِ مبادلہ کی واپسی کے اقدامات کئے۔ اپنی پہلی نشری تقریر میں انھوں نے کہا "میں نہیں چاہتا کہ پاکستان کا روپیہ غیر ملکی کرنسی میں تبدیل ہو کر غیر ممالک میں جائے۔ لہٰذا ایسے تمام لوگوں سے جنہوں نے اس قسم کا روپیہ باہر رکھا ہوا ہے، میں کہوں گا کہ وہ چند دنوں میں ایسی رقمیں واپس منگوا لیں۔ میں چند دنوں میں احکامات جاری کرنے والا ہوں۔ لہٰذا جو لوگ پاکستان کا خون (روپیہ) باہر لے گئے ہیں۔ وہ یہ خون فوراً واپس لے آئیں۔ لوگوں کو وہ خون چاہیئے، ہماری فوجوں کو یہ خون چاہیئے، میں کسی کو باہر نہیں جانے دوں گا۔ میں کسی کی فنی کو نہیں چھوڑوں گا۔ جب تک باہر کے ممالک سے پاکستان کا روپیہ واپس نہ آ جائے۔" اسٹیٹ بینک میں زرِ مبادلہ کے گوشوارے جمع کرانے کی آخری تاریخ ۱۵ر جنوری مقرر کی گئی۔ سرمایہ داروں پر دباؤ ڈالنے کے لئے ۲۳ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو ۲۲ سرمایہ دار خاندانوں کے تمام افراد کے پاسپورٹ ضبط کر لئے گئے۔ ۲۶ر دسمبر کو جنرل حبیب اللہ اور یکم جنوری احمد داؤد اور فخرالدین ولیکا کو گرفتار کر لیا گیا۔ ۳۰ر دسمبر کو صدر بھٹو نے دھمکی دی کہ اگر سرمایہ داروں نے بیرونی ممالک سے اپنی دولت واپس لانے میں مزید تاخیر کی تو ان کی تمام جائیدادیں ضبط کر لی جائیں گی۔ ۱۲ر جنوری ۱۹۷۲ء کو مارشل لاء کا ضابطہ ۱۰۴ جاری کیا گیا۔ جس میں کہا گیا کہ "اگر ۱۵ر جنوری تک بیرونِ ملک جمع زرِ مبادلہ کے گوشوارے اسٹیٹ بنک میں جمع نہیں کرائے گئے، تو خلاف ورزی کرنے والوں کو عمر قید کی سزا دی جائے گی۔"

۱۵ر جنوری ۱۹۷۲ء تک صرف بارہ کروڑ روپیہ کا زرِ مبادلہ ظاہر کیا گیا۔ ۱۸ر جنوری کو ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مرکزی وزیرِ خزانہ ڈاکٹر مبشر نے کہا کہ "سرمایہ داروں نے بارہ کروڑ روپیہ کا زرِ مبادلہ ظاہر کیا ہے جس میں سے صرف ساڑھے سات کروڑ روپیہ واپس آ سکتا ہے۔ باقی ۴½ کروڑ روپیہ بھارت، برما، سیلون اور تنزانیہ جیسے ملکوں میں جمع ہے۔ ان ملکوں نے زرِ مبادلہ کی واپسی پر پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ سرمایہ واپس پاکستان نہیں آ سکتا۔" وزیرِ خزانہ نے بتایا کہ زرِ مبادلہ نہ لانے والوں کو سزائے موت دینے پر غور کیا جا رہا ہے۔ اور تحقیقات کے لئے پولیس کے خصوصی دستے مقرر کئے گئے ہیں۔

"نیوز ویک" کی رپورٹ کے مطابق پاکستانی سرمایہ داروں کا ۵۰ کروڑ روپیہ غیر ممالک میں جمع تھا۔ جبکہ سرمایہ داروں نے صرف بارہ کروڑ روپیہ ظاہر کیا۔ چنانچہ حکومت نے زرِ مبادلہ کی واپسی کی آخری تاریخ میں توسیع کر دی، اور ۱۵ر فروری مقرر کی، لیکن سرمایہ داروں نے اب بھی گوشوارے جمع نہیں کرائے۔ سرمایہ داروں کے خلاف کارروائی کرنے کی بجائے حکومت سرمایہ داروں کے سامنے جھک گئی۔ جنرل حبیب اللہ، احمد داؤد اور ولیکا کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا۔ اور ۱۵ر مارچ سرمایہ داروں کے ضبط شدہ پاسپورٹ بحال کر دیئے گئے۔ حکومت کی خاموشی ——— سرمایہ داروں کی غیر مشروط رہائی اور پاسپورٹ کی بحالی کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ آل پاکستان فیڈریشن آف چیمبرس آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے ایڈمنسٹریٹر اشرف تابانی نے اربابِ اقتدار سے ملاقات کی اور کہا کہ "اگر حکومت داؤد، ولیکا اور جنرل حبیب اللہ کو غیر مشروط طور پر رہا کر دے، تو فیڈریشن حکومت کی ضرورت کے مطابق زرِ مبادلہ مہیا کر دے گی۔" حکومت اس بات پر رضامند ہو گئی اور تینوں سرمایہ داروں کو رہا کر دیا۔ لیکن بعد میں فیڈریشن اپنے وعدہ سے منحرف ہو گئی۔ اور حکومت پر دباؤ ڈالا گیا کہ معاہدے پر اسی صورت میں عمل ہو سکتا ہے جب حکومت مزدوروں پر سختی کرے۔ معاہدے کی خلاف ورزی کرنے پر حکومت نے فیڈریشن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ بلکہ اس معاہدے کو عوام سے چھپایا۔

مجیب کی رہائی اور بنگلہ دیش

صدر بھٹو نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد اپنی نشری تقریر میں مشرقی پاکستان کو مسلم بنگال کا نام دیتے ہوئے پاکستان کا حصہ قرار دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ "مسلم بنگال یقینی طور پر پاکستان کا ایک حصہ ہے اور وہ ہمیشہ نظریۂ پاکستان پر عمل کرے گا کیونکہ یہی سچا اور صحیح نظریہ ہے۔ مشرقی پاکستان کے عوام سے مل کر تمام معاملات طے کرنے کو تیار ہوں۔ شرط صرف یہ ہے کہ یہ سیاسی تصفیہ ایک پاکستان کے ڈھانچے کے اندر ہو، خواہ یہ باہمی تعلق کتنا ہی ڈھیلا ڈھالا کیوں نہ ہو۔" چنانچہ خیرسگالی کے جذبات پیدا کرنے کے لئے ۲۱ر دسمبر کو شیخ مجیب الرحمان کو جیل سے نکال کر گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ صدر بھٹو نے مجیب سے مذاکرات کئے اور اس ملاقات میں کیا طے پایا، اس سے عوام کو بے خبر رکھا گیا۔ ۳ر جنوری کو کراچی کے جلسہ عام میں مجیب کی رہائی کا اعلان کیا گیا۔ ابتداء میں صدر بھٹو متحدہ پاکستان پر زور دیتے رہے۔ ۱۸ر فروری کو بی بی سی کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے صدر بھٹو نے کہا کہ "مشرقی پاکستان کی موجودہ صورتِ حال عارضی ہے۔ پاکستان دوبارہ متحد ہو جائے گا۔" چنانچہ جن ممالک نے بنگلہ دیش تسلیم کیا، ان سے سفارتی تعلقات توڑ لئے گئے۔ لیکن جب برطانیہ نے بنگلہ دیش کو تسلیم کیا تو حکومت نے دولتِ مشترکہ سے نکلنے کا فیصلہ کیا۔ جب روس نے بنگلہ دیش کو تسلیم کیا تو حکومت نے "احتجاج" بھی نہیں کیا۔ بلکہ جن ممالک سے سفارتی تعلقات توڑے گئے تھے وہ استوار کرنے شروع کر دیئے۔ حکومت کے اس اقدام سے معلوم ہوتا تھا کہ پیپلز پارٹی کی حکومت بنگلہ دیش تسلیم کرنا چاہتی ہے۔ آخر کار ۱۴ر اگست کو قومی اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے صدر بھٹو نے واضح طور پر بنگلہ دیش کے قیام کی حمایت کی اور کہا کہ "قراردادِ پاکستان میں دو خود مختار ریاستوں کا لفظ استعمال کیا گیا تھا۔" آئینی سمجھوتے میں صرف چار صوبوں کا ذکر کیا گیا۔ مشرقی پاکستان کے بارے میں بالکل خاموشی اختیار کی گئی۔ اس کے بعد صدر بھٹو نے بنگلہ دیش کرانے کی مہم کا آغاز صوبہ سرحد سے کیا۔ اور یہ دلیل پیش کی گئی کہ چوہدری رحمت علی کے دیئے ہوئے لفظ "پاکستان" میں بنگال کا ذکر کہاں ہے، بنگلہ دیش کے قیام سے پہلے اور فوجی کارروائی کے بعد پیپلز پارٹی کی قیادت ہمیشہ یہ کہا کرتی تھی کہ مشرقی کے عوام علیحدہ ہونا نہیں چاہتے صرف مٹھی بھر لوگ علیحدگی کی تحریک چلا رہے ہیں، لیکن دورہ سرحد میں صدر بھٹو نے بنگلہ دیش کے قیام کو مشرقی پاکستان کے عوام کی خواہشات کا اظہار بتایا۔ بنگلہ دیش کے مسئلے پر پاکستان پیپلز پارٹی بار بار اپنا موقف بدل رہی ہے۔ حال ہی میں کولمبیا براڈکاسٹنگ

باقی صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ فرمائیں

جماعتِ اسلامی نے موقع سے فائدہ اٹھایا



لاہور کے وکلا پولیس کی حراست میں

پیپلز پارٹی کی حکومت بار بار قلابازیاں کھا رہی ہے

واقفِ حال

بنگلہ دیش کے مسئلے پر عوام ایک عرصے سے ذہنی انتشار کا شکار ہیں۔ اور ان کے ذہنوں میں جو شکوک و شبہات موجود تھے، ان کا اظہار جلوسوں اور مظاہروں کی شکل میں ہونے لگا ہے۔ صدر بھٹو نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے لئے سب سے پہلے صوبۂ سرحد کا انتخاب کیا تھا۔ بلا شبہ یہ ان کے لئے سب سے "محفوظ" علاقہ تھا۔ اس علاقے میں نیپ، قیوم لیگ اور جمعیت علمائے اسلام کا اثر بہت زیادہ ہے۔ نیپ اپنی "بین الاقوامی اسٹریٹجی" کے تقاضے پورے کر رہی ہے، اور اس کا شروع ہی سے یہ مطالبہ رہا ہے کہ بنگلہ دیش کو جلد از جلد اور غیر مشروط طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ جہاں تک قیوم لیگ اور جمعیت العلمائے اسلام کا تعلق ہے، وہ دونوں سرکار دربار سے آشنائی اور وابستگی کی بنا پر "جی حضوری" کی پالیسی پر عمل کر رہی ہیں۔ چنانچہ توقع کے مطابق صوبۂ سرحد کی طرف سے کوئی خاص مزاحمت نہیں ہوئی۔ بلوچستان پوری طرح نیپ کے تسلط میں ہے، اس لئے وہاں سے بھی کسی مخالفت کا امکان موجود نہیں ہے۔ پیپلز پارٹی ان دو صوبوں کی طرف سے پوری طرح مطمئن تھی، لیکن پنجاب کو چھیڑنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ ہر شخص کو اس بات کا اندازہ تھا کہ اس سلسلے میں پنجاب کی طرف سے شدید مخالفت کی جائے گی۔ چنانچہ جب پیپلز پارٹی کے کنونشن میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے حق میں قرار دادیں پیش کی جا رہی تھیں، تو راولپنڈی کے ہزاروں طلبہ سڑکوں پر نکل کر "بنگلہ دیش نامنظور" کے نعرے لگا رہے تھے۔ یہاں تک کہ کنونشن کے دوران بھی اس مسئلے پر زبردست ہنگامے ہوئے۔

اب تک جو بات ڈھکے چھپے اور مبہم انداز میں کہی جا رہی تھی، وہ راولپنڈی کے کنونشن میں واضح ہو کر سامنے آ گئی۔ پیپلز پارٹی کی حکومت ہر قیمت پر بنگلہ دیش کو منظور کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ صوبۂ سرحد کا دورہ خاصی حد تک کامیاب رہا، اسی لئے راولپنڈی میں یہ بات بڑے حوصلہ کے ساتھ کہی گئی کہ "اگر عوام بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے تو وہ اپنے لئے دوسری حکومت منتخب کر لیں۔"

دراصل پیپلز پارٹی کے رہنما اس مسئلے پر پنجاب کے عوام کا ردِ عمل جاننے کے لئے بے تاب تھے۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ پنجاب کی طرف سے کس حد تک مخالفت ہو گی۔ کہنے

کل کشمیر کے بدلے راجستھان کے ریگستان کا سودا ہو سکتا ہے

کو تو وہ عوام کو دوسری حکومت منتخب کرنے کی "پیش کش" کر چکے تھے، لیکن دراصل اس طرح وہ اس ردعمل کی شدت کم کرنا چاہتے تھے جو پنجاب کے عوام کی طرف سے متوقع تھی۔ یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا، جو کامیاب نہیں ہو سکا۔ صرف پیپلز پارٹی کے چند گنے چنے "جی حضوریے" بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی بات کر رہے تھے اور لوگوں کو بنگلہ دیش تسلیم نہ کرنے کے "نتائج و عواقب" سے آگاہ کر رہے تھے۔

کنونشن کے فوراً بعد پنجاب کے مختلف شہروں میں بڑے پیمانے پر مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چنانچہ ایک بار پھر پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کو اپنا لہجہ تبدیل کرنا پڑا اور وہ اس قسم کے بیانات دینے لگے کہ اگر عوام بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے تو ایسا نہیں کیا جائے گا، اور یہ کہ ہم جانتے ہیں اگر ہم نے فوری طور پر بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کیا تو مجیب اپنے تمام وعدوں سے پھر جائے گا۔ یہ رائے عامہ کو مخصوص خطوط پر ہموار کرنے کی ایک اور کوشش تھی۔ اب اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ عوام چند شرائط کے ساتھ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے پر راضی ہو جائیں۔ اب عوام کو یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ بنگلہ دیش اثاثوں کی ادائیگی سے انکار کر رہا ہے، اس لئے وہ اس نکتے پر اصرار نہ کرے تو یہ پاکستان کی بہت بڑی کامیابی ہو گی، اور ہم اس وقت بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیں گے۔

یہ پیپلز پارٹی کی پرانی "تکنیک" ہے، پہلے تو تانو چک کے مسئلے پر ہنگامے کھڑے کئے گئے۔ اس بات کا دعویٰ کیا گیا کہ بھارت اور بنگلہ دیش کے فوجی افسروں کے درمیان تانو چک سے متعلق، بلیسویں نقشے پر اتفاق رائے ہو گیا تھا۔ روزانہ اخبارات کے صفحات سیاہ ہوتے رہے۔ اور پھر اچانک اسٹیج کے پیچھے تانو چک کے بدلے کوئی دوسرا علاقہ لینے پر رضامندی کا اظہار کر دیا گیا۔ لیکن عوام کے ذہنوں میں جو سوالات ابھر رہے ہیں، ان کا جواب کون دے گا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تانو چک کا علاقہ اتنا ہی غیر اہم تھا تو بھارت اس پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے اتنا بیتاب کیوں تھا۔ اگر دونوں علاقوں کی اہمیت یکساں تھی، تو یہ مسئلہ اتنا طول کیوں پکڑتا گیا۔ اس سوال کا جواب نظر نہیں آتا ہم یہ کہ اگر پاکستان کے پاس، وزارت خارجہ کے دعوے کے مطابق، اس بات کے دستاویزی ثبوت موجود تھے کہ دونوں ممالک کے درمیان بلیس نقشوں پر اتفاق رائے ہوا تھا، تو وہ ان دستاویزی ثبوت کی بنیاد پر غیر ممالک میں بھارت کی اس دھاندلی کو بے نقاب کیوں نہیں کرتا۔ پہلے تو اتنا شور مچایا گیا اور پھر اتنی خاموشی کے ساتھ اس مسئلے کو دبا دیا گیا۔

بنگلہ دیش کے مسئلے پر بھی پیپلز پارٹی کے رہنما بار بار قلابازیاں کھاتے رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان پر فوجوں نے حملہ کیا تو صدر بھٹو نے کہا "خدا کا شکر ہے، پاکستان بچ گیا!" اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ "ایک پاکستان" کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے بات کر رہے تھے۔ اس وقت انہوں نے مشرقی پاکستان کے عوام پر فوج کشی کو حق بجانب قرار دیا تھا۔

پھر جب مشرقی پاکستان میں نام نہاد ضمنی انتخابات ہوئے تو دائیں بازو کی انتہا پسند، رجعت پسند جماعتوں کے ساتھ پیپلز پارٹی نے بھی اپنے امیدوار کھڑے کئے۔ اس طرح پیپلز پارٹی نے عملی طور پر بنگلہ دیش کے قیام کی مخالفت کی۔ پھر پیپلز پارٹی کے رہنما کھلم کھلا اس بات کا اعلان کر رہے تھے کہ "پاکستان ایک تھا اور ایک رہے گا"۔ لیکن جب مشرقی پاکستان کے رجعت پسند رہنماؤں نے وہاں کے عوام کی تاریخ کا رخ موڑنے کیلئے بھارتی فوجوں کی مدد سے "آزادی" حاصل کر لی اور پاکستان کے ترانوے ہزار فوجی بھارت کی قید میں چلے گئے تو پیپلز پارٹی کی قیادت کو اپنے پرانے "اصولوں" سے دستبردار ہونا پڑا۔

معاہدہ شملہ ہوا، جس میں پاکستان نے بھارت کو اس بات کا یقین دلایا کہ وہ بنگلہ دیش کو تسلیم کر لے گا۔ معاہدہ شملہ کے بعد پیپلز پارٹی کے رہنما، جن میں صدر بھٹو پیش پیش تھے، اپنے پچھلے موقف سے ہٹ کر قرارداد پاکستان کو اپنے رنگ میں پیش کرنے لگے۔ اب یہ کہا جانے لگا کہ قرارداد پاکستان کے مطابق بنگلہ دیش ایک الگ مملکت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس وقت انھوں نے اپنے پچھلے موقف پر شرمندگی کا اظہار کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ وہ "خدا کا شکر ہے، پاکستان بچ گیا" کے الفاظ بھول گئے، اور عوام سے یہ توقع کرنے لگے کہ وہ "یہ بھی صحیح اور وہ بھی صحیح" کے اصول کے تحت ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں گے۔

جب سے پیپلز پارٹی برسر اقتدار آئی ہے، عوام کو اسی قسم کے مبہم بیانات کا سامنا پڑ رہا ہے۔ اس کے ہر عمل پر تضاد کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ اگر ہم برسر اقتدار آ گئے تو ملک میں جمہوری نظام قائم کیا جائے گا۔ ہر شخص کو تنقید کرنے کا حق ہو گا۔ پریس آزاد ہو گا، سرمایہ دار



پولیس کا ہاتھ اور شہری کا گریبان

اور جاگیردار کونوں میں منہ چھپاتے پھریں گے۔ مزدور اور کسان معاشرے کی قیادت کریں گے۔ لیکن جب اسے اقتدار ملا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ پیپلز پارٹی کے تمام نعرے بے جان تھے۔ اس ایک سال کے مختصر عرصے میں اس کا اصل کردار پوری طرح بے نقاب ہو چکا ہے۔ سرمایہ دار اور جاگیردار "محب وطن" اور مزدور اور کسان گویوں کے حقدار ہو گئے ہیں۔ مخالفت میں بات کرنے والا ہر فرد "غدار" ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کے حق میں آواز اٹھانے والے "غیر ملکی ایجنٹ" ہیں۔ آج ہزاروں مزدور جیلوں میں بند ہیں۔ پیپلز پارٹی پر چھائے ہوئے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی مخالفت کرنے والوں پر انتہائی مذموم قسم کے مقدمات بنائے جا رہے ہیں۔ ہر دوسرے شہر میں دفعہ ۱۴۴ لگی ہوئی ہے۔ بات بات پر طاقت کا استعمال کرنے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ پولیس اور فوج کے ذریعے حکومت کرنے کا رجحان اب تک ختم نہیں ہوا۔

بنگلہ دیش کے مسئلے پر پنجاب کے شہروں میں مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوا تو پیپلز پارٹی کی حکومت نے اپنی روایات کے مطابق بے دریغ طاقت کا استعمال کیا۔ ہزاروں افراد کو پکڑ کر جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ وکلاء کے جلوس کو طاقت کے ذریعے کچل دیا گیا۔ ایک طرف تو یہ باتیں کی جا رہی تھیں کہ ہم برسر اقتدار آنے کے بعد ملک میں ایک ایسا جمہوری ماحول قائم کریں گے، جس میں ہر شخص کو اختلاف کرنے کا حق حاصل ہو گا، اور دوسری طرف گورنر پنجاب ایوب خانی لہجہ اختیار کرتے ہوئے یہ اعلان کر رہے ہیں کہ "ابھی تو ہم نے اپنی طاقت کا دسواں حصہ بھی استعمال نہیں کیا"۔ ایک طرف تو یہ کہا گیا کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے مسئلے پر ملک میں ریفرنڈم کرایا جائے گا، اور دوسری طرف یہ اعلان کیا



ضلع کچہری لاہور کے باہر پولیس آنسو گیس پھینک رہی ہے

اب یہی جماعت نظریۂ پاکستان کی سب سے بڑی پرچارک بنی بیٹھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جماعت اسلامی نے بنگلہ دیش کے مسئلے کو الجھانے میں اتنا ہی اہم کردار ادا کیا ہے، جتنا کہ پیپلز پارٹی نے کیا ہے۔

پیپلز پارٹی کی حکومت پر جہاں نیپ کی طرف سے دباؤ پڑ رہا ہے، وہیں ملک کے سرمایہ دار بھی اسے بنگلہ دیش کو جلد از جلد تسلیم کرنے پر اکسا رہے ہیں۔ سرمایہ داروں کا مفاد یہ ہے کہ وہ بنگلہ دیش کی مارکیٹ سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ ان کا اندازہ یہ ہے کہ بنگلہ دیش ہمیشہ کے لئے روسی تسلط میں نہیں رہے گا، امریکہ بھی اسے اپنا حلقۂ اثر بنانا چاہتا ہے۔ اس صورت میں انھیں بنگلہ دیش میں سرمایہ کاری کرنے کا موقع مل جائے گا۔ امریکہ کی طرف ہماری حکومت کے جھکاؤ کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ لیکن بنگلہ دیش پر بھارت کا غلبہ اپنی جگہ موجود رہے گا۔ اس لئے اب پاکستانی حکام بھارت سے خاصمت کی پرانی پالیسی کو ترک کرنے کی طرف مائل ہیں۔ پہلے بھارت کو دشمن نمبر ایک قرار دیا جاتا تھا، اہم مسائل سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے بار بار اس کا ہوّا کھڑا کیا جاتا تھا لیکن اب اسی دشمن نمبر ایک سے پرامن تعلقات قائم کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں پہلے کشمیر کو آزاد کرانے کی باتیں ہوتی تھیں، اب کشمیر کا مسئلہ کشمیریوں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ عجب نہیں کہ جس طرح آج تانو چک کے بدلے دوسرا علاقہ لے لیا گیا ہے اسی طرح کل کشمیر کے بدلے راجستھان کے ریگستان لینے پر آمادگی کا اظہار کر دیا جائے۔ پاکستانی سرمایہ داروں کے نقطۂ نظر سے بنگلہ دیش سے تجارت کرنے کے لئے بھارت سے تعلقات معمول پر لانا ناگزیر ہو گیا ہے، اور اب وہ بھارت کو "خوش" کرنے کے لئے ہر داؤ آزما رہے ہیں۔ اسی لئے اب ہزار سال تک جنگ کرنے کی بجائے بھارت سے پرامن تعلقات قائم کرنے کا پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔

جہاں تک ہمارے موقف کا سوال ہے۔ ہم اس وقت بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ ہماری نظر میں بنگلہ دیش کی آزادی "فراڈ" ہے۔ دوسرے ملک کی فوجوں کی مدد سے آزادی حاصل کرنا، ایک شرمناک تصور ہے۔ بنگلہ دیش پہلے مغربی پاکستانی سرمایہ داروں کے تسلط میں تھا اور اب وہ بھارتی توسیع پسندوں اور روسی ترمیم پسندوں کے چنگل میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے محب وطن عوام اب بھی پورے حوصلے کے ساتھ اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ مجیب کی رجعت پسند حکومت نے ان پر عقوبتوں کے دروازے کھول رکھے ہیں۔ جب تک بنگلہ دیش صحیح معنوں میں آزاد نہیں ہو جاتا، اس وقت تک ہم اسے تسلیم نہیں کریں گے۔ بنگلہ دیش کی رجعت پسند حکومت کو تسلیم کر کے ہم عوامی لیگ کے غنڈوں کے ہاتھ مضبوط کریں گے، جو دن دہاڑے وہاں کے سچے وطن پرستوں کا قتلِ عام کر رہے ہیں۔ ہم بنگلہ دیش کے ان سچے وطن پرستوں کی مدد اسی طرح کر سکتے ہیں۔

جماعت اسلامی جن سنگھیوں کے انداز میں بنگلہ دیش کو پاکستان کا اٹوٹ انگ قرار دیتی ہے۔ اس کے خیال میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے نظریۂ پاکستان کا جواز ختم ہو جائے گا۔ لیکن ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ تاریخ کا پہیہ پیچھے کی طرف نہیں گھوما کرتا۔ بنگلہ دیش اب کبھی پاکستان کا حصہ نہیں بن سکتا۔ اگر "اسلامی جذبے" میں اتنی ہی کشش ہوتی تو آج مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ کی مسلم ریاستیں یوں باہم برسرِ پیکار نہ ہوتیں۔ ہمیں یقین ہے کہ بنگلہ دیش کے عوام جو ہمیشہ سے ظالم قوتوں کے خلاف جدوجہد کرتے رہے ہیں، اپنے انقلابی رہنماؤں کی قیادت میں حقیقی آزادی حاصل کر کے رہیں گے اور اس وقت ہم بنگلہ دیش کی حکومت کو عوام کی نمائندہ انتظامیہ کی حیثیت سے تسلیم کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔

جہاں تک پیپلز پارٹی کی حکومت کا تعلق ہے، وہ اب عوام میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے کہ اگر اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل ہو سکے تو ہمیں بنگلہ دیش کو ضرور تسلیم کر لینا چاہیئے۔ لیکن عوام میں اس کے اس متوقع اقدام کے خلاف زبردست بے چینی پائی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے، پیپلز پارٹی کی حکومت اپنی طاقت کے "بقیہ نو صفحے" استعمال کر کے ایک بار پھر عوام کی خواہشات کو کچلنے میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن بنگلہ دیش کے مسئلے پر اس نے جس طرح قلابازیاں کھائی ہیں، اس سے اس کی موجودہ حیثیت پر زبردست اثر پڑے گا۔ حقیقتوں کو مسخ کر کے پیش کرنے والوں کا زمین سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔

گیا کہ "چونکہ قومی اسمبلی عوام کی نمائندگی کرتی ہے، اس لئے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے مسئلے پر اس سے منظوری لی جائے گی" (کیونکہ یہ اسمبلی انگوٹھا چھاپ اسمبلی بن کر رہ گئی ہے)۔

پنجاب میں ان ہنگاموں کے پیچھے دائیں بازو کی انتہا پسند، رجعت پسند پارٹی، جماعت اسلامی کا ہاتھ ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عوام میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ خود پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کو اس بات کا احساس تھا کہ اس سلسلے میں پنجاب کی طرف سے ضرور مخالفت ہو گی۔ وہاں کے عوام میں مخالف رجحانات موجود تھے۔ اور جماعت اسلامی نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے، اس کی قیادت اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی ہے۔ بدقسمتی سے حقیقی ترقی پسند حلقے ابھی تک بے یقینی کی کیفیت سے دوچار ہیں۔ عوام کا شعور آگے بڑھ رہا ہے۔ اور وہ پیچھے ہیں۔ ان میں سے بعض حلقے غیر ارادی طور پر پیپلز پارٹی کا دُم چھلا بنے ہوئے ہیں، اس لئے وہ غیر شعوری طور پر ہر مسئلے کو پیپلز پارٹی کی عینک سے دیکھنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر یہ حلقے ان منفی رجحانات کا شکار نہ ہوتے تو جماعت اسلامی جیسی رجعت پسند پارٹی کو پیشِ عملی INITIATIVE اپنے ہاتھ میں لینے کا موقع نہ ملتا۔

یہ وہی جماعت اسلامی ہے جس کے رضاکاروں نے ہزاروں نہتے بنگالیوں کا قتلِ عام کیا تھا۔ یہ وہی جماعت اسلامی ہے جس نے قیامِ پاکستان کی مخالفت کی تھی اور

ہفت روزہ
الفتح
۸۰ ڈی نرسری (کمرشل ایریا) کراچی ۵

کلرک نمبر — مارچ میں شائع ہوگا

۱۰۰ روپے سے ۵۰۰ روپے تک کے انعامات

کلرکوں پر کیا گزرتی ہے؟

۱- کلرکوں کے معاشی، معاشرتی مسائل اور ان کا حل
۲- بدعنوان افسروں کا پردہ چاک
۳- کلرک کی سچی آپ بیتی
۴- محکموں یا اداروں کی اندرونی کہانیاں
۵- ملازمت کیسے ملی
۶- ناقابل فراموش واقعات
۷- کلرک - ٹریڈ یونین کا بہترین کارکن
۸- کلرک: جو انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنا

کسی ایک عنوان پر لکھیئے۔ مضمون کاغذ کے ایک طرف، صاف اور ستھرا لکھا جائے۔ ہر موضوع میں سے بہترین مضمون پر انعام دیا جائے گا۔ وصولی کی آخری تاریخ ۳۱ جنوری ۷۳ء ہے۔ اپنے مضمون کے ساتھ درج ذیل کوپن ضرور بھیجئے، اس کے بغیر مضمون مقابلے میں شامل نہیں ہو سکے گا۔ مصنف کی خواہش پر اس کا نام اور پتہ خفیہ رکھا جائیگا۔

کوپن

نام ------ دفتر کا پتہ ------------

رہائش کا پتہ ------------ تاریخ ------

میں منصفین کے فیصلے کا پابند ہوں گا — دستخط

۳۴

انچارج انعامی مقابلہ۔ ہفت روزہ الفتح - ۸۰ ڈی۔ نرسری (کمرشل ایریا) کراچی-۲۹ فون ۴۱۲۲۷۴

ہفت روزہ الفتح کراچی

خاص مضمون

دربابِ سوشلزم و کمیونزم — (۱)

گُڑ کھائیں اور گُلگُلوں سے پرہیز کریں

منہاج برنا

ادھر کچھ دنوں سے سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ مفادات اور ذہنیت کے علمبردار "شرفاء" نے ایک نیا نظریاتی اور سیاسی فتنہ کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ سوشلزم تو اچھی چیز ہے لیکن کیمونزم انتہائی بُری، معیوب اور خطرناک چیز ہے۔ اس قسم کی بات صرف دو طرح کے لوگ کہہ سکتے ہیں۔ ایک وہ جو سوشلزم سے واقف ہیں اور نہ کیمونزم سے اور دوسرے وہ جو دونوں کی حقیقت اور ان کے باہمی رشتہ سے بخوبی آگاہ ہیں لیکن جو دونوں کے بارے میں محنت کش عوام کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور جن کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اِن لوگوں نے اشتراکی معاشرہ اور اشتراکی نظام قائم کرنے کے جو جھوٹے وعدے کئے تھے ان سے بتدریج انحراف کر سکیں۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ جو حضرات اس نوع کی لغو باتیں کر رہے ہیں وہ ایک ہی سانس میں سائنٹیفک سوشلزم کے حامی ہونے کا بھی دم بھرتے ہیں اور اُسی کے ساتھ کمیونزم پر لعنت بھی بھیجتے ہیں۔ کہتے ہیں ہم سوشلسٹ ضرور ہیں لیکن ہم کمیونسٹ نہیں کیونکہ ہم مسلمان کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں۔

لیکن، ع دروغ گو را حافظہ نباشد

ابھی کچھ دن کی بات ہے کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے پہلے جماعت اسلامی اور دائیں بازو کی جماعتوں نے یحییٰ شیر علی ٹولے کی قیادت میں یہ مہم چلائی تھی کہ جو خود کو سوشلسٹ کہے وہ مسلمان نہیں، اور یہ کہ اسلام کا قلم لگانے سے بھی سوشلزم پاک نہیں ہو جاتا۔ ان کی ساری مہم کا نشانہ مسٹر بھٹو، اُن کی پیپلز پارٹی اور اُس کا سوشلسٹ یا "اسلامی سوشلسٹ" پروگرام تھا۔ کفر کے فتوے بھی سوشلزم اور سوشلسٹوں کے خلاف جاری کئے گئے تھے۔ لیکن سرمایہ داروں، جاگیرداروں، اور سامراجیوں کے اِن وظیفہ خوار سیاست دانوں کی ساری کوششیں اکارت گئیں۔ ملک کے محنت کش عوام نے سوشلزم کے خلاف مذہب کے ان ٹھیکیداروں، فتویٰ نویسوں کو رَد کر دیا۔ ان کے خلاف انتخابات میں ووٹ دیا اور پیپلز پارٹی اور مسٹر بھٹو کو جتایا۔ دراصل ان کا ووٹ پیپلز پارٹی اور مسٹر بھٹو کے حق میں اتنا نہیں جتنا کہ اشتراکیت اور اشتراکی نظام پر مبنی وعدوں اور نعروں کے حق میں تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ پاکستان کے محنت کش عوام، مزدور، کسان، طالب علم اور انقلابی دانشور ۲۲ سال کے تلخ تجربات کے بعد اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ انہیں مذہب اور نظریہ پاکستان کے نام پر زبردست دھوکا دیا گیا۔ ان مقدس اصطلاحوں کے ذریعہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ لوٹ کھسوٹ کو برقرار رکھا گیا۔ مزدوروں اور کسانوں پر مظالم روا رکھے گئے، ایک طرف عوام کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی اور دوسری طرف سرمایہ داروں کی تجوریاں اور بینک بیلنس بڑھتے گئے، جن کا ایک ملزم تھا انہوں نے پانچ اور فیکٹریاں کھڑی کر لیں، جاگیردار بدستور دادِ عیش دیتے رہے۔ ملک کی آزادی، اقتدار اعلیٰ اور اس کی اقتصادی ترقی کو غیر ملکی سامراجیوں کے فوجی معاہدوں اور مشروط نام نہاد امداد کے عوض گروی رکھ دیا گیا۔ ایک طرف خواندگی کی شرح گھٹتی گئی تو دوسری طرف نوجوانوں کو، مار دھاڑ، قتل و غارت گری، جنسی جرائم، تشدد اور جارحیت کی امریکی سامراجی ثقافت سے روشناس کرایا گیا۔ ملک میں جس نوع کی نیم آبادیاتی اور نیم جاگیردارانہ معیشت رائج تھی اس میں بورژوا طرز کی پارلیمانی جمہوریت کا پروان چڑھنا بھی ناممکن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شہری آزادیوں کا دائرہ تنگ سے تنگ تر ہوتا گیا۔ جمہوری طور طریقوں پر پہلی کاری ضرب غلام محمد نے لگائی، پھر چوہدری محمد علی اور سکندر مرزا نے اور آخر کو ایوب خاں نے فوجی آمریت قائم کر کے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ باقی کام یحییٰ خاں کے فوجی ٹولے نے انجام دیا۔ اور نصف پاکستان کھو دیا۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ جملہ حضرات اسلام، پاکستان اور نظریۂ پاکستان کے سب سے بڑے نام لیوا تھے۔

ان حالات میں سوشلزم اور سوشلسٹ نظریات کا مقبول ہونا ایک فطری امر تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ دور ہی سوشلزم کی فتح اور سرمایہ دارانہ اور سامراجی نظام کی شکست کا دور ہے۔ اور اس کے انقلاب اور اُس کے بعد چین کے انقلاب نے سرمایہ دارانہ نظام کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ دنیا کے لوگوں نے پہلی بار اپنی آنکھوں کے سامنے لوٹ کھسوٹ کے نظام کو ختم ہوتے دیکھا، کسانوں اور مزدوروں کی حکومت کو قائم ہوتے دیکھا، افلاس، بے روزگاری، جہالت

اور بیماری کا خاتمہ ہوتے دیکھا اور ایسی سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی ترقی کی ایک نئی دنیا قائم ہوتے دیکھی جس میں انسانی اخوت اور مساوات، علم و سائنس اور مادی اور روحانی ارتقا کے دیدہ زیب پھول کھلے ہوئے ہیں اور جہاں بلند حوصلگی، عظمت، شجاعت، اخلاص اور مستقبل پر اعتماد اور ایقان کا سورج انسان اور اس کی زندگی کو حرارت اور تابندگی عطا کرتا رہتا ہے۔

پاکستان کے محنت کش عوام بھی اِن عظیم تغیرات اور انقلابات سے متاثر ہوئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج وہ سوشلزم اور کمیونزم کو غیر ملکی نظریہ قرار نہیں دیتے، کیونکہ وہ علم کو اپنا کھویا ہوا سرمایہ سمجھتے ہیں۔ سوشلزم اور کمیونزم ایک سائنس ہے ایک علم ہے جس کے ذریعہ سماج کے تاریخی ارتقاء، معاشرے کے تضادات، ان کے ٹکراؤ، اور معاشرہ میں تغیر و انقلاب کے عوامل سے آگاہی حاصل کی جاتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس علم کے ذریعہ جاگیردارانہ، سرمایادارانہ اور سامراجی لوٹ کھسوٹ اور غلامی کے نظام سے نجات حاصل کرنے اور محنت کشوں کی حکومت اور ایک انسانی اور منصفانہ سماج کے قیام کے گُر سیکھے جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ استحصالی نظام کے علمبرداروں کو اس علم اور سائنس سے اتنا ہی ڈر لگتا ہے جتنا کہ پاگل کُتّے کے کاٹے ہوئے شخص کو پانی سے ڈر لگتا ہے۔ اور اسی لئے یہ اپنے مفادات کو باقی رکھنے کے لیے سوشلزم اور کمیونزم کے نظریات پر طرح طرح کی بہتان تراشی کرتے ہیں اور عوام کو اُن سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس پس منظر میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سوشلزم کے بعض نام نہاد علم بردار اب کمیونزم اور کمیونزم کے حامیوں پر کیوں حملہ آور ہو رہے ہیں، کیوں یہ ثابت کرنے کی ناکام اور بھونڈی کوشش کر رہے ہیں کہ سوشلزم اور کمیونزم دو مختلف و متضاد چیزیں ہیں، سوشلزم جائز ہے لیکن کمیونزم ناجائز۔ مسلمان صرف سوشلسٹ ہو سکتا ہے، کمیونسٹ نہیں ہو سکتا وغیرہ وغیرہ۔

سوشلزم اور اسلام دونوں کے دشمن

پہلی بات تو سمجھ لینے کی یہ ہے کہ جو لوگ یہ ڈینگ ہانک رہے ہیں وہ نہ سوشلسٹ ہیں اور نہ سچے مسلمان، وہ اسلام اور سوشلزم دونوں کو اپنے طبقاتی مفادات کے تحفظ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اور اسی لئے انہیں مسخ کرنے اور اپنی ضروریات کے مطابق توڑنے مروڑنے سے بھی باز نہیں آتے۔ انہوں نے دیکھا کہ جب اسلام کے مقدس نام پر وہ اپنے استحصالی نظام کو برقرار نہیں رکھ سکتے تو انہوں نے اشتراکی نعروں کو اپنا لیا۔ اور ان کو استعمال کرکے الیکشن جیت لئے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اشتراکیت کو بطور نعرہ کے اور الیکشن جیتنے کیلئے استعمال کرتے ہیں وہ کبھی بھی اشتراکیت کو صحیح معنوں میں نہیں اپناتے اور نہ اشتراکی نظام کے قیام ہی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اُن کی صرف یہ کوشش رہتی ہے کہ چند صنعتوں کو جزوی طور پر ریاستی تحویل میں لے کر اور چند فروعی اور سطحی اصلاحات کرکے لوگوں کو اس مغالطے میں مبتلا کر سکیں کہ بس یہی کچھ سوشلزم ہے۔

اُن کا دوسرا کام یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو نظریاتی طور پر دھوکا دے سکیں، سوشلزم اور کمیونزم کی غلط تعبیریں کریں اور اس طرح دونوں پر حملہ آور ہوں۔

سائنٹیفک سوشلزم کے بانی کیا کہتے ہیں

چنانچہ اب یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ایک طرف محنت کشوں کو دھوکا دینے کے لئے سائنسی سوشلزم کی تائید کی جا رہی ہے اور دوسری طرف یہ کہا جا رہا ہے کہ سوشلزم ٹھیک اور کمیونزم خطرناک ہے۔ آیئے دیکھیں کہ سائنسی سوشلزم SCEIENTIFIC SOCIALISM کے بانی سوشلزم اور کمیونزم کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

ساری دنیا کے پڑھے لکھے لوگ کارل مارکس اور فیڈرک اینگلز کو سائنٹیفک سوشلزم کا بانی قرار دیتے ہیں۔ کارل مارکس نے سب سے پہلے ابتدائی اشتمالی اور اشتراکی تصورات کو جن کی حیثیت خوبصورت خوابوں سے زیادہ نہ تھی سائینسی اور حقیقی بنیادوں پر اُستوار کیا۔

کارل مارکس کے نزدیک سوشلزم اور کمیونزم دو متضاد اور باہم متصادم تصورات اور نظام نہیں۔ سوشلزم سرمایہ دارانہ نظام کے بطن سے پیدا ہوتا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کی طبقاتی آویزش اور جدوجہد اور مزدور طبقہ کی شعوری جدوجہد کا لازمی اور لابدی نتیجہ ہے، کمیونزم اور کمیونسٹ معاشرہ بھی اشتراکی یا سوشلسٹ نظام کی انتہائی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اشتراکی یا سوشلسٹ نظام کمیونسٹ نظام کا پہلا زینہ یا پہلی منزل ہے جس میں اقتدار اور ریاست کی مشینری پر مزدور طبقہ کا جو معاشرہ کا سب سے زیادہ فعال طبقہ ہے قبضہ ہوتا ہے، تمام ذرائع پیداوار قومی تحویل میں لے لئے جاتے ہیں اور پیداوار اور تقسیم اشیاء کا ایک ایسا منصفانہ طریقہ رائج کیا جاتا ہے جس میں محنت کشوں کے استحصال کے سرچشمے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اور باقی ماندہ سرمایہ دار اور استحصالی عناصر اور طبقات کو اس کا موقع نہیں دیا جاتا کہ وہ لوٹ کھسوٹ کے نظام کو بحال کر سکیں۔ اس نظام کے تحت پیداواری طاقتیں اور خود اشیاء کی پیداوار تیزی سے بڑھتی ہے۔ تہذیب، ثقافت، کلچر اور تعلیم کے دروازے تمام عوام پر کھل جاتے ہیں۔ اور انسانی معاشرہ ہمہ جہت ترقی کرتا ہے۔ اشتراکی دور میں قبائلی جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ ادوار کے فرسودہ انسان دشمن اور عوام دشمن فلسفے، نظریات، قوانین اور رسوم و رواج پر کاری ضرب لگائی جاتی ہے اور معاشرہ کے نظریاتی ڈھانچہ کو یکسر بدل کر کے اشتراکی نظریات، قوانین اور انسان دوست انقلابی رسوم کو فروغ دیا جاتا ہے۔ اشتراکی نظام میں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے پیداوار اور پیداواری طاقتیں تیزی سے بڑھتی ہیں، ضیاع اور استحصال کے سوتے بند ہو جاتے ہیں اس لئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ جملہ محنت کشوں کے روزگار، خوراک، لباس، مکان، تعلیم، اور علاج معالجہ کی بنیادی ضروریات پوری کی جا سکیں۔

لیکن چونکہ اشتراکی نظام کو سرمایہ دارانہ نظام کی باقیات سے بھی نمٹنا پڑتا ہے اور پیداواری طاقتیں بتدریج ہی ترقی کر سکتی ہیں۔ اس لئے لوگوں کو اشیاء کی تقسیم ان کی محنت کے مطابق کی جاتی ہے۔ مارکس نے اشتراکی یا سوشلسٹ نظام میں تقسیم اشیاء کا یہ فارمولا واضح کیا ہے: "ہر شخص اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق کام کرے گا اور ہر شخص کو اس کے کام کے برابر معاوضہ ملے گا۔"

کمیونزم اور کمیونسٹ معاشرہ

اس کے مقابلے میں کمیونسٹ معاشرہ ایک ایسے نظام کا نام ہے جو سوشلسٹ معاشرہ کی زبردست مادی، پیداواری، تہذیبی اور ثقافتی ترقی کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے، جب طبقات ختم ہو جاتے ہیں اور ریاست اور ریاستی مشینری کی جو ایک طبقہ کے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے وجود میں آتے ہیں ضرورت باقی نہیں رہتی اور ریاست بتدریج ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ مارکس کے نزدیک انسانی معاشرہ میں تصادم، ٹکراؤ اور جنگ کی بنیادی وجہ طبقات اور طبقاتی مفادات کا وجود ہے، جس کے نتیجہ میں استحصال پیدا ہوتا ہے۔ جب

باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ فرمایئں

الفتح

سندھ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن

۵۷۵ سرکاری بسیں فروخت کردی گئیں

پردہ چاک

دو لاکھ روپے کے ٹائر چند روز میں ناکارہ ہوگئے

الفتح رپورٹ

سندھ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن قومی ادارہ ہے جو عوام کے خون پسینہ کی گاڑھی کمائی سے چلائی جارہی ہے۔ لیکن اس قومی ادارے کے سرمائے کو نوکر شاہی اور بدعنوان عملہ کی ملی بھگت سے دونوں ہاتھوں سے لوٹا جارہا ہے۔ سابق ڈی۔آئی۔جی میاں بشیر احمد صدیقی کو کارپوریشن کا چیئرمین مقرر کردیا گیا۔ یہ بھی نوکرشاہی کے کرتوت ہیں کہ ایک سابق پولیس افسر کو قومی ادارے کا سربراہ بنادیا گیا جو ٹرانسپورٹ کے مسائل کی ابجد سے واقف نہیں ہیں۔ اسی طرح کارپوریشن کی مالیات پر ایک ایسے آدمی کا قبضہ ہے جو مبینہ طور پر کارپوریشن کے ذرائع کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کررہا ہے۔ یہ صاحب چھوٹے عملے میں سخت گیر اور متعصب افسر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔

کارپوریشن میں بدعنوانی، اقرباپروری، جعلسازی اور پرزہ جات کی چوری کے واقعات نے اپنے پنجے گاڑ دیئے ہیں۔ جس شخص کو کارپوریشن کی جو چیز ہاتھ لگ جاتی ہے، اُسے وہ مال غنیمت سمجھ کر گھر لے جاتا ہے۔ اُوپر سے نیچے تک بدعنوانی کا اس قدر زور اور چرچا ہے کہ کسی کا کوئی ہاتھ پکڑنے والا ہے، نہ احتساب کا خوف۔ ٹرانسپورٹ کے ماہرین کا خیال ہے۔ اگر چند مہینے اسی رفتار سے بدعنوانیاں جاری رہیں تو کارپوریشن کو مزید کروڑوں روپے کا خسارہ ہوگا۔

کارپوریشن کے پاس ایک ہزار ایک سو بسیں ہیں لیکن افسران کی نااہلی اور بدعنوانی کے سبب تقریباً آٹھ سو بسیں ناکارہ حالت میں گیراجوں اور ڈپوؤں میں کھڑی ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ ناکارہ بسوں کے پرزے اور مشین سستے داموں میں فروخت کردی گئیں۔ اس طرح کراچی سے سکھر تک کارپوریشن کی صرف تین سو بسیں روزانہ چل رہی ہیں۔ اس صورت حال سے ادارہ کو موجودہ مالی سال کے چار ابتدائی چار مہینوں میں یعنی اپریل ۱۹۷۲ء تک پچاس لاکھ سے زیادہ رقم کا نقصان ہوچکا ہے۔

ادارہ کی مجموعی آمدنی کے مقابلہ میں اخراجات میں برابر اضافہ کیا جارہا ہے۔ ادارہ کے وسائل کو بڑے بڑے افسروں کی براہ راست تقرری اور ان کی بڑی بڑی تنخواہوں پر بے دریغ ضائع کیا جارہا ہے۔ خسارے کو قومی خزانے کے ذریعہ پورا کیا جاتا ہے۔ گذشتہ دو تین ماہ کے دوران سفارش اور اقرباپروری کی بنیاد پر ۱۱۴ افسروں کی براہِ راست تقرری کی گئی۔ ان میں تین ڈسٹرکٹ مینجر، تین ورکس مینجر، ایک ٹریفک مینجر، دو اسسٹنٹ ٹریفک مینجر، ایک اسٹیشن سپرنٹنڈنٹ اور ایک مارکیٹنگ و اسٹور کیپر شامل ہیں۔ یہ تقرریاں یونین اور انتظامیہ کے معاہدے کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے کی گئیں۔ معاہدے کے رو سے ادارے میں کام کرنے والے سینیئر اور تجربہ کار لوگوں کو ان اسامیوں پر ترقی دینی چاہئے تھی، مگر اس معاہدے کی دھجیاں اڑاتے ہوئے نوکرشاہی نے رشوت اور سفارش کی بنیاد پر باہر سے بھرتی کرکے ادارہ کی مالی حیثیت کو عملاً نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ ان تقرریوں میں صوبائی عصبیت کا جذبہ بھی کارفرما رہا۔ ۴ دسمبر ۱۹۷۲ء کو ڈپٹی ڈائریکٹر کی خالی آسامی پر ایک شخص نورالدین دھامانی کو ۱۵۰۰ روپیہ ماہانہ تنخواہ، ۲۵۰/ روپیہ کراچی الاؤنس اور ۶۵۰ روپے رہائشی الاؤنس پر رکھا گیا۔ یہ تقرری بھی براہ راست اور سفارش کی بنیاد پر کی گئی، اس نئی تقرریوں کی مجموعی تعداد ہی تک پہنچ چکی ہے، جس پر سالانہ ایک لاکھ پچاس ہزار روپے کے فضول اور غیرضروری اخراجات بڑھائے گئے ہیں۔ موجودہ ڈپٹی ڈائریکٹر مالیات مظہرالدین خان کے لئے ایسے حالات پیدا کئے جارہے ہیں کہ وہ مجبور ہوکر ادارہ کو خیرباد کہہ دیں۔ اسی طرح ایک دوسرے تجربہ کار اور محنتی ورکس مینجر مصباح الرحمان کو کورنگی ڈپو سے ہٹاکر زائد قرار دے دیا گیا اور اس کی جگہ ایک نئے ورکس مینجر کی براہ راست تقرری کی گئی۔ سنٹرل ورکشاپ لانڈھی میں ایک نئے شخص کو ورکس مینجر کی آسامی پر سینیئر اسکیل دے کر براہِ راست بھرتی کی گئی۔ نئی اور براہ راست تقرریوں میں نوکرشاہی نے ادارے کے قواعد و ضوابط کا بھی خیال نہیں رکھا۔ اہلیت و قابلیت کی بنیاد پر انتخاب اور اخباروں میں اشتہارات کے ذریعے درخواستیں طلب کرنے کے طریقۂ کار کو سرے سے نظرانداز کیا گیا۔ اگر کسی نے زبان ہلائی تو اس کے سر پر بے روزگاری کی تلوار لٹکادی گئی۔

خواجہ محمد رفیع کو موجودہ چیئرمین نے کسی بات پر خوش ہوکر مارکیٹنگ اور اسٹور افسر کی اعلیٰ اسامی پر بمشاہرہ ۱۹۵۰/- روپے پر بھرتی کرلیا۔ بتایا جاتا ہے کہ مذکورہ شخص ایک پارٹی گولڈن موٹر اسٹور کے ایجنٹ کی حیثیت سے متعارف ہوا تھا۔ کارپوریشن کے قریبی ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ بعض مبینہ دھاندلیوں کی پردہ پوشی کے لئے اس شخص کی تقرری عمل میں لائی گئی ہے۔ حالانکہ مذکورہ شخص اس عہدے کا اہل نہیں ہے۔ چنانچہ نئے مارکیٹنگ افسر کے کام کو چلانے کے لئے اقبال احمد کو ۶۵۰/- روپے اور دیگر الاؤنس دے کر رکھا گیا ہے۔

کارپوریشن میں فاضل پرزہ جات کی چوری معمول بن گیا ہے۔ اب تک لاکھوں روپے کا نقصان پہنچایا جاچکا ہے۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو فاضل پرزہ جات کی خریداری کے لئے ٹینڈر کھولے گئے۔ نرخ ظاہر ہونے کے بعد کارپوریشن کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے اپنے ایجنٹ کی توسط سے ایک بڑی

الفتح

سَو باڈیوں کی جگہ ساٹھ باڈیوں کی تیاری کا راز کیا ہے؟

پارٹی سے درپردہ ساز باز کر کے ٹنڈر بھروایا اور چور دروازہ سے مقابلہ میں شریک کر دیا۔ چونکہ نرخ پہلے کھل چکے تھے اس لئے اعلیٰ افسر کی چہیتی پارٹی ایک لاکھ روپے سے زائد کا آرڈر لینے میں کامیاب ہو گئی۔ کراچی اور حیدر آباد کی دیگر پارٹیوں کی پرانی ادائیگیوں کا اگر ریکارڈ چیک کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کسی پارٹی کو دو ہزار سے زیادہ کی ادائیگی نہیں کی گئی۔ لیکن اس پارٹی کو بنظر خاص بیس ہزار روپے ادا کر دیئے گئے — چیئرمین اور ممبر مالیات کی اس کھلی جانبداری سے اس پارٹی کے ساتھ ان کی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ مختلف پارٹیوں کی طرف سے روانہ کردہ مال کو سنٹرل ورکشاپ میں خورد برد کر دیا جاتا ہے، پرزہ جات کی پیٹیوں کو کھول کر ان میں پرانے اور بے کار پرزے بھر دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح ہر سال لاکھوں روپے کے کارآمد اور نئے پرزوں کو فروخت کر دیا جاتا ہے چند ماہ پیشتر سنٹرل ورکشاپ میں ٹنڈر کے مطابق مختلف پارٹیوں کی طرف سے لاکھوں روپے کا مال آنے والا تھا۔ اس بار بھی خفیہ طریقہ سے لاکھوں روپے کے پرزہ جات کی ہیرا پھیری کا منصوبہ بنایا گیا جس کی خبر کسی نہ کسی طرح انتظامیہ کے ایک ممبر کو لگ گئی۔ انہوں نے مبینہ ہیرا پھیری کی روک تھام کے لئے چند احتیاطی تدابیر عمل میں لائیں۔ یہ بات ادارہ کے ایک بدعنوان اعلیٰ افسر کو معلوم ہو گئی۔ چنانچہ سنٹرل ورکشاپ میں مال پہنچنے سے قبل ہی اس آدمی کا تبادلہ کسی دوسری جگہ کر کے میدان صاف کر لیا گیا۔

چند ماہ قبل سو کے قریب غیر معیاری چیسس خرید کر جہاں قومی سرمایہ کو ضائع کیا گیا وہاں نوکر شاہی اور اس کے حاشیہ برداروں نے اپنی جیبیں گرم کیں۔ پتہ چلا کہ یہ چیسس لبسوں کے معیار پر پورے نہیں اترے چنانچہ ادارہ کو لاکھوں روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ ابھی حال ہی میں بی ایل ایم سی کے مزید ۷۵ چیسس کا سودا کیا گیا ہے۔ نوکر شاہی جان بوجھ کر ایسی غیر معیاری گاڑیاں خریدتی ہے جو سال ڈیڑھ سال کے بعد کھٹارہ بن کر ورکشاپوں اور ڈپوؤں کی زینت بن جاتی ہیں۔ بدعنوانی یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ باڈیوں کی خریداری میں ہزاروں روپے کی ہیرا پھیری کی جاتی ہے۔ کراچی میں لبسوں کی سو باڈیوں میں سے ساٹھ باڈیاں تیار کرائی گئیں۔ یہ تیار شدہ باڈیاں مطلوبہ ٹنڈر کے معیار کے مطابق نہیں ہیں۔ مثلاً اینگل آئرن، چادریں اور لکڑی تھرڈ کلاس کی لگائی گئی ہے۔ ان کے متعلق تحریری رپورٹیں دی گئیں، مگر انہیں نظر انداز کر دیا گیا۔

چار ماہ پیشتر ایک پارٹی سے درپردہ ساز باز کر کے ۵،۵ ناکارہ لبسوں کا سودا کیا گیا۔ اس میں سویڈن سے تحفہ کے طور پر ملنے والی ۴۹۱ لبسیں بھی شامل تھیں۔ ساٹھ لاکھ روپے کے عوض یہ سودا طے کیا گیا تھا۔ پارٹی کو کھلی چھوٹ دی گئی کہ وہ اس معاہدے سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ پارٹی سے بطور پیشگی ایک پیسہ نہیں لیا گیا۔ اس کے علاوہ معاہدے کی رُو سے ان ناکارہ لبسوں کو چار ماہ کی مدت میں توڑ پھوڑ کر منتقل کرنا تھا۔ لیکن ابھی تک صرف سو لبسیں بمشکل تمام اٹھائی گئی ہیں۔ ایسے سودوں میں مسلمہ اصولوں کے مطابق پارٹی سے سودے کی کل رقم میں سے ¼ تا ½ حصہ تک بطور پیشگی وصول کیا جاتا ہے تاکہ پارٹی درمیانی مدت میں بھاگ جائے تو پیشگی کی رقم بحق سرکار ضبط کر لی جائے۔ لیکن ادارہ کی نوکر شاہی اس قسم کے سودے میں عام طور پر قواعد وضوابط کو نظر انداز کر کے لاکھوں روپے کما لیتی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس دوران ان ناکارہ لبسوں کے تمام پرزہ جات کو بھی غائب کر دیا گیا۔

نئی خریداری کے تحت آنے والی لبسوں کو چھ ماہ کے اندر اندر کھٹارہ بنانے میں بدعنوان عملہ ان دنوں کچھ زیادہ سرگرم ہو گیا ہے۔ قیمتی اور پائیدار پُرزے نکال کر موٹر پارٹس کے ڈیلروں سے فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اور ان کی جگہ ناکارہ پارٹس لگا دیئے جاتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں لبسوں کے لئے چھ والٹ کی چار سو لائٹ ڈیوٹی بیٹریاں خریدی گئیں۔ بات دراصل یہ تھی کہ ایکسائڈ والوں کی یہ بیٹریاں فنی خامی کی وجہ سے بازار میں نہیں کھپ رہی تھیں، لہٰذا بدعنوان افسران نے اندر ہی اندر معاملہ طے کر کے یہ بیٹریاں قومی ادارے کے گلے میں ڈال دیں۔ اس دھاندلی اور بدعنوانی پر کچھ لوگوں نے احتجاج کیا تو انہیں ٹرانسفر کر دیا گیا۔

کارپوریشن کی لبسوں کے لئے پنجاب کی ایک فرم سے دو لاکھ روپے سے زیادہ استعمال شدہ ٹائروں کی خریداری کی گئی۔ خریدنے سے قبل اصولاً فرم سے سولہ ہزار میل فی ٹائر کی ضمانت طلب کرنی تھی، لیکن ضمانت لی گئی اور نہ بنک گارنٹی نتیجہ یہ نکلا کہ یہ ٹائر چند یوم کے اندر اندر پھٹ گئے۔ اس بدعنوانی کو چھپانے کے لئے متعلقہ ریکارڈ میں جعلی اندراجات کے ذریعہ ٹائروں کی کارکردگی مطلوبہ میل کے مطابق دکھا دی گئی۔ اس طرح قومی ادارے کو ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے کا نقصان پہنچایا گیا۔

ایک ہی میک اور قسم کے پرزہ جات کے نرخوں کا گذشتہ تین ماہ کی خریداری سے متعلق ملیر، حیدر آباد اور سکھر کے ڈپوؤں کے ریکارڈ کی چھان بین کی جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی کہ مختلف پرزہ جات کے نرخوں میں کراچی، اور حیدر آباد کے مقابلے میں سکھر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہزاروں روپے کی ہیرا پھیری اور بدعنوانیاں ہو رہی ہیں۔ اور کارپوریشن کو ہر طرف سے معقول حصہ مل رہا ہے۔

ماہ ستمبر ۱۹۷۲ء میں قومی ادارے کے مفاد پرست بدعنوان اور سازشی ٹولہ ٹنڈروں کے ذریعہ تقریباً ۱۰ لاکھ روپے کے فاضل پرزہ جات مہنگے داموں خریدنے والا تھا۔ اس خبر کا علم محب وطن عناصر کو ہو گیا۔ انہوں نے خبردار کیا کہ اگر ادارہ کو مالی نقصان پہنچایا گیا تو اس کے نتائج ان کے حق میں اچھے نہ ہوں گے۔ چنانچہ اگلے دن تیار شدہ آرڈروں کی غلطیوں کو درست کرایا گیا۔ اور از سرِ نو نظر ثانی کی گئی۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو بذریعہ ٹیلیگرام کارپوریشن کے اعلیٰ افسران کو مزید خبردار کیا گیا۔ ٹیلیگرام کا اثر یہ ہوا کہ اخباری اشتہار کے ذریعہ از سرِ نو ٹینڈر طلب کئے گئے۔ یہ ٹنڈر ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو کھولے گئے۔ اگر ان دونوں ٹنڈروں کے نرخ کا تقابلی گوشوارہ مرتب کیا جائے تو اصل فرق معلوم ہو جائے گا۔ بعد والے ٹنڈر میں نرخ آسمان سے اتر کر زمین پر پہنچ گیا۔ اگر اس مبینہ بدعنوانی کے خلاف قبل از وقت آواز نہ اٹھائی جاتی تو ممکن تھا کہ کارپوریشن کو ایک بار پھر لاکھوں روپے کا نقصان پہنچایا جاتا۔

سندھ روڈ ٹرانسپورٹ کے اعلیٰ افسران کی مبینہ دھاندلیوں اور بدعنوانیوں کے متعلق آزاد پریس وقتاً فوقتاً آواز بلند کرتا رہا ہے۔ لیکن ابھی تک حکومت نے ان لوگوں کے خلاف کسی قسم کی کارروائی نہیں کی جو ہر سال قومی ادارے کے سرمائے کو ضائع کر رہے ہیں اور بدعنوانی کے ذریعہ اپنے بینک بیلنس میں ہزاروں لاکھوں روپے کا اضافہ کر رہے ہیں۔ دوسری طرف کارپوریشن کے محب وطن، ایماندار اور محنتی عملے کو جائز حقوق سے محروم کر کے انہیں انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ کارپوریشن کی مبینہ دھاندلیوں کی مؤثر روک تھام کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ کسی ریٹائرڈ جج کی سربراہی میں ایک اعلیٰ اختیاری کمیٹی کے ذریعے، تمام معاملات کی چھان بین کرائی جائے اور قومی ادارے کو نقصان پہنچانے والے افراد کو سخت ترین سزائیں دی جائیں۔

نارمن بیتھون کی یاد میں

۲۱ دسمبر ۱۹۳۹ء



ماؤزے تنگ

صدر ماؤ نے یہ مضمون عظیم انقلابی کارکن ڈاکٹر نارمن بیتھون کی وفات کے بعد لکھا تھا، جس میں انہوں نے نارمن بیتھون کے لازوال جذبوں کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اگلے صفحے پر ہم نارمن بیتھون کا ایک شہرۂ آفاق مضمون شائع کر رہے ہیں، جس میں انہوں نے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ کون سے طبقات سماج کے سینے پر زخموں کی تخلیق کرتے ہیں (ادارہ)

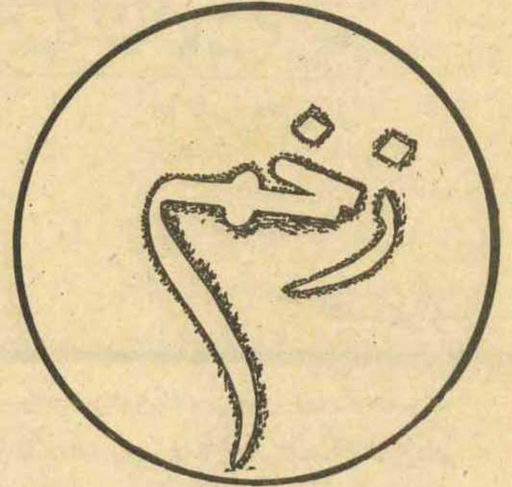
کامریڈ نارمن بیتھون، کینیڈا کی کمیونسٹ پارٹی کے ایک رکن، پچاس سال کے لگ بھگ تھے جس وقت کینیڈا اور امریکہ کی کمیونسٹ پارٹیوں نے انہیں چین بھیجا۔ انھوں نے جاپان کے خلاف ہماری جنگِ مزاحمت میں ہماری مدد کے لئے ہزاروں میل کا سفر بجلی کی طرح طے کیا۔ وہ گذشتہ سال موسمِ بہار میں ینان پہنچے، کوہ او تھائی میں کام کرنے گئے اور ہمیں بہت افسوس ہے کہ وہاں انہوں نے اس محاذ پر کام کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ یہ کون سا جذبہ ہے جو ایک غیر ملکی کو چینی عوام کی آزادی کے نصب العین کو بے غرضی کے ساتھ خود اپنا نصب العین سمجھنے پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ جذبۂ بین الاقوامیت ہے، جذبۂ اشتراکیت، جس سے ہر چینی کمیونسٹ کو سیکھنا چاہیئے۔ لینن ازم یہ سکھاتا ہے کہ عالمی انقلاب صرف اس وقت فتح مند ہو سکتا ہے، جبکہ سرمایہ دار ممالک کا پرولتاریہ نوآبادیاتی اور نیم آبادیاتی عوام کی جدوجہدِ آزادی کی حمایت کرے اور نوآبادیاتی و نیم نوآبادیاتی ممالک کا پرولتاریہ سرمایہ دار ممالک کے پرولتاریہ کی جدوجہدِ آزادی کی حمایت کرے۔ کامریڈ بیتھون نے اس لیننی اصول پر عمل کیا۔ ہم چینی کمیونسٹوں کو بھی یہ اصول عملی طور پر اپنانا چاہیئے۔ ہمیں تمام سرمایہ دار ممالک کے پرولتاریہ سے جاپان، برطانیہ، امریکہ، جرمنی، اٹلی اور دوسرے ممالک کے پرولتاریہ سے متحد ہو جانا چاہیئے کیونکہ یہ سامراجیت کا تختہ الٹنے، اپنی قوم اور عوام کو آزاد کرانے، دنیا کی دوسری اقوام اور عوام کو آزاد کرانے کا واحد طریقہ ہے۔ یہ ... بین الاقوامیت ہے، وہ بین الاقوامیت جس کے ذریعہ ہم تنگ نظر قوم پرستی اور تنگ نظر حب الوطنی کی مخالفت کرتے ہیں۔

کامریڈ بیتھون کے جذبے، اپنی ذات کا خیال کئے بغیر خود کو پوری طرح دوسروں کے لئے وقف کر دینا، کا اظہار اپنے کام میں بے پناہ احساسِ ذمہ داری اور تمام کامریڈوں اور عوام کے لئے ان کی بے انتہا گرم جوشی سے ہوتا تھا۔ ہر کمیونسٹ کو ان سے سیکھنا چاہیئے۔ ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں ہے جو اپنے کام میں غیر ذمہ دار ہیں، بھاری کام پر ہلکے کام کو ترجیح دیتے ہیں۔ بھاری کام دوسروں پر ڈال کر، ہلکا کام اپنے لئے چنتے ہیں۔ ہر موقع پر وہ دوسروں سے پہلے اپنے بارے میں سوچتے ہیں۔ جب کبھی وہ تھوڑا سا کام کر لیتے ہیں تو غرور سے پھول جاتے ہیں اور اس خدشے کے تحت کہ دوسروں کو اس کا علم نہیں ہوگا، اس کے بارے میں ڈینگیں ہانکتے پھرتے ہیں، ان کے دل میں کامریڈوں اور عوام کے لئے گرمجوشی کا جذبہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ سرد، بے تعلق اور لاتعلق ہوتے ہیں۔ درحقیقت ایسے لوگ کمیونسٹ نہیں ہوتے، یا کم از کم ان کا شمار پوری طرح مخلص کمیونسٹوں میں نہیں ہو سکتا۔ محاذ سے واپس آنے والا کوئی بھی فرد ایسا نہیں تھا جس نے، جب بھی بیتھون کا نام آیا، تحسین کا اظہار نہ کیا ہو اور کوئی ان کے جذبے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ شانسی، چاہار۔ ہوپے سرحدی علاقے میں کوئی بھی سپاہی یا شہری جس کا علاج ڈاکٹر بیتھون نے کیا تھا یا جس نے انہیں کام کرتے دیکھا، ایسا نہ تھا جو ان سے متاثر نہ ہوا ہو۔ کامریڈ بیتھون سے ہر کمیونسٹ کو یہ سچا کمیونسٹ جذبہ سیکھنا چاہیئے۔

کامریڈ بیتھون ایک ڈاکٹر تھے، زخم بھرنے کا فن ان کا پیشہ تھا اور وہ مسلسل اپنی مہارت کو مکمل کر رہے تھے، جو آٹھویں روٹ فوج کی طبی سروس میں بہت اعلیٰ اور ارفع تھی۔ ان کی مثال ان لوگوں کے لئے ایک غیر معمولی سبق ہے جو جس لمحے بھی کوئی مختلف چیز دیکھتے ہیں اپنا کام تبدیل کر دینا چاہتے ہیں، اور جو تکنیکی کام کو بے نتیجہ اور مستقبل کے لئے بے سود سمجھ کر حقیر قرار دیتے ہیں۔

کامریڈ بیتھون سے میری صرف ایک مرتبہ ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے بہت سے خطوط لکھے۔ لیکن میں مصروف تھا اور میں انھیں صرف ایک خط لکھ سکا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ انھیں وہ خط ملا بھی یا نہیں مجھے ان کی وفات سے بہت دُکھ پہنچا ہے، اب ہم ان کی یاد منا رہے ہیں، جس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ ان کے جذبے نے ہر ایک کو کتنی شدت کے ساتھ متاثر کیا ہے۔ ہم سب کو ان سے مکمل بے غرضی کے جذبے کو سیکھنا چاہیئے۔ ہر ایک فرد اس جذبے کے ساتھ عوام کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ ایک آدمی کی قابلیت زیادہ یا کم ہو سکتی ہے، لیکن اگر اس میں یہ جذبہ پایا جاتا ہے تو وہ شریف النفس و بے داغ ہے، وہ ایک ایسا آدمی ہے جو اخلاقی دیانت کا حامل اور بے ہودہ مفادات سے بالاتر ہے۔ ایک ایسا آدمی ہے جو عوام کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔





زخم

ڈاکٹر نارمن بیتھون

ممتاز سرجن نارمن بیتھون کینیڈا کمیونسٹ پارٹی کے رکن تھے۔ ۱۹۳۶ء میں جب جرمن اور اطالوی فسطائی ڈاکوؤں نے اسپین پر حملہ کیا تو وہ محاذ پر گئے اور فسطائیت دشمن اسپینی عوام کے لئے کام کیا۔ چینی عوام کو ان کی جاپان کے خلاف مزاحمت کی جنگ میں مدد کرنے کے لئے وہ ایک طبّی وفد کے سربراہ کی حیثیت سے ۱۹۳۸ء کے موسم بہار میں ینان گئے۔ فوراً بعد ہی وہ شانسی۔ چاہار و ہوپے سرحدی علاقے میں چلے گئے۔ گہری بین الاقوامیت اور عظیم کمیونسٹ جذبے سے سرشار ہو کر انہوں نے آزاد شدہ علاقوں کی فوج اور عوام کی تقریباً دو برس تک خدمت کی۔ ایک زخمی سپاہی کا آپریشن کرتے ہوئے ان کے خون میں زہر پھیل گیا۔ ۱۲ نومبر ۱۹۳۹ء کو تھانگ شیئن، ہوپے میں انتقال کر گئے۔ (ادارہ)

سر کے اوپر مٹی کے تیل کا لیمپ شہد کی مکھیوں کے چھتے کی مانند مسلسل بھنبھنا رہا ہے۔ مٹی کی دیواریں، مٹی کا فرش اور مٹی کا پلنگ سفید کاغذ کی کھڑکیاں، کمرے میں بسی ہوئی خون اور کلوروفارم کی بُو، سردی، صبح کے تین بجے، یکم دسمبر، مقام لن چو (شمالی چین میں)، آٹھویں روٹ آرمی کے ساتھ۔

کچھ زخم چھوٹے خشک تالابوں کی طرح ہیں، جیسے کہ بھوری مٹی کے ساتھ پکے ہوئے ہوں۔ کچھ ایسے ہیں جو کناروں سے پھٹے ہوتے ہیں، اور ان پر سیاہ ناسور کی بیل لگی ہوئی ہے۔ کچھ زخم صاف ہیں۔ کچھ پیپ کی گہرائیوں میں ڈوبے ہوتے ہیں، جو پشتوں سے گھرے ہوئے دریا کی مانند کسی گرم چشمے کی طرح، پٹھوں کے گرد اور ان کے اندر سے گھومتی ہوئی مضبوط پٹھوں کے چاروں طرف ٹھہری ہوئی ہے۔ کچھ زخم باہر کی طرف پھیل رہے ہیں، اور گوشت کے مسلے ہوئے پھولوں کی طرح بکھرے نظر آتے ہیں۔ کچھ زخم ایسے ہیں جن کے جمے ہوئے لوتھڑوں سے سیاہ خون بدبودار گیس کے ایسے بلبلوں کے ساتھ رستا رہتا ہے، جو خون کے تازہ سیلاب کے اوپر تیر رہے ہیں۔ پرانی گندی پٹیاں کھال سے گوند کی طرح چپکی ہوئی ہیں۔ ذرا احتیاط سے۔ انھیں ذرا گیلا کر۔ گولی تو ران کے اندر تک گھس گئی ہے۔

ٹانگ کو اوپر اٹھاؤ۔ کیا وجہ ہے کہ یہ ٹانگ ایک لمبی سی ڈھیلی ڈھالی جراب کی طرح ہے، کس قسم کی جراب؟ کیا کرسمس اسٹاکنگ جیسی (عیسائی کرسمس کے موقع پر بچوں کے تحائف رکھنے کے لئے ایک بڑی سی سرخ جراب استعمال کرتے ہیں، جسے کرسمس اسٹاکنگ کہتے ہیں)؟ کہاں ہے وہ عمدہ مضبوط ہڈی کی نالی؟ کہاں ہے؟ اس کے تو دس بارہ ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ اپنی انگلیوں سے ان ٹکڑوں کو اٹھاؤ، جو کتے کے دانتوں کی طرح سفید، تیز اور نوکیلے ہیں۔ ذرا دیکھو کوئی اور ٹکڑا باقی ہے؟ ہاں یہ رہا! کیا سب ٹکڑے پورے ہو گئے۔ ہاں۔ نہیں۔ یہ رہا ایک اور ٹکڑا۔ کیا یہ پٹھا بے جان ہو چکا ہے؟ چٹکی سے دبا کر دیکھو ہاں یہ بے جان ہو چکا ہے۔ اسے کاٹ کر پھینک دو، وہ کس طرح ٹھیک ہوگا؟ یہی پٹھے جو ایک وقت اتنے مضبوط تھے، اب اتنی بوسیدہ اور تباہ حالت میں، اپنا کام سرگرمی کے ساتھ کس طرح شروع کر سکتے ہیں۔ ان کی دھجیاں اڑ چکی ہیں۔ وہ کس طرح کھینچ سکتے ہیں۔ وہ جوان کا سکڑنے اور پھیلنے کا کھیل تھا، ختم ہو چکا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا اب تو ہم تباہ ہو گئے، ہم کیا کر سکتے ہیں؟

اور کوئی ہے؟ کیا! ایک سترہ سالہ نوجوان جس کے پیٹ میں گولی لگی ہوئی ہے۔ کلوروفارم تیار ہے؟ پھولی ہوئی گلابی آنتوں کے لچھے نظر آ رہے ہیں، جن میں سے بدبو نکل رہی ہے۔ چار چھید ہیں۔ انھیں ٹانکے لگا کر بند کرو۔ ہاں، جو پیڑو (PELVIS) میں خون جمع ہے، اسے پونچھو۔ نالیاں۔ تین نالیاں ہیں، مشکل سے بند ہوں گی۔ لڑکے کو گرم کس طرح رکھیں ان اینٹوں کو گرم پانی میں ڈال دو۔

ناسور (GANGERINE) بھی کیسا چالاک ہے۔ خوب پھلتا ہے۔ کیا یہ والا زندہ ہے؟ ہاں تکنیکی نقطۂ نظر سے تو زندہ ہے۔ جلدی سے اس کی ورید میں نمکین پانی، (SALINE SOLUTION) ڈالو۔ ممکن ہے اس کے جسم کے چھوٹے چھوٹے لاتعداد خلیوں (CELLS) کو یاد آ جاتے۔ شاید انھیں اپنا قدیم آبائی سمندر یاد آ جائے، جہاں کروڑوں

الفتح

سال پہلے سورج کی ابھرتی ہوئی موجوں میں، سورج کی روشنی میں زندگی کی ابتداء ہوئی۔ ہاں شائد یہ ان کو اپنے چھوٹے چھوٹے تھکے ہوئے سر اٹھانے کی اتنی ہمت دے سکے کہ وہ جی بھر کر سیلائن پی سکیں، اور جد وجہد کر کے دوبارہ زندہ ہو جائیں۔ دیکھو تو شاید ہو جائیں۔

اور یہ والا لڑکا ؟ کیا وہ اپنے خچر کے ساتھ فصل کی کٹائی کے وقت سڑکوں پر خوشی سے چلاتا ہوا بھاگ سکے گا۔ نہیں اب وہ کبھی نہیں دوڑ سکے گا۔ بھلا کوئی ایک پاؤں سے بھی بھاگتا ہے ؟ پھر وہ کیا کرے گا ؟ وہ اور لڑکوں کو بیٹھ کر دیکھے گا۔ تو وہ کیا سوچے گا ؟ جیسا کہ آپ اور میں سوچتے ہیں۔ ترس کھانے سے کیا فائدہ ؟ اس پر ترس نہ کھاؤ، اس سے اس کی قربانی توہین ہوگی، وہ قربانی جو اس نے چین کے دفاع کے لئے دی ہے۔ اس کو اپنے بازوؤں میں سنبھالو وہ ایک بچے کی طرح، میرے بچے کی طرح اور تمہارے بچے کی طرح ہلکا ہے۔

جسم بھی کتنی حیرت انگیز چیز ہے۔ اس کے اعضاء کتنے مکمل ہوتے ہیں۔ کتنی باریکیوں کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔ اور یہ جتنا تابعدار مضبوط اور قابلِ فخر ہے، اتنا ہی خوفناک ہوتا ہے جبکہ اس کی دھجیاں اڑ چکی ہوں۔ زندگی کا ننھا سا چراغ آہستہ آہستہ مدھم ہوتا ہے۔ اور ایک دم بھڑک کر خاموش ہو جاتا ہے۔ پھر ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ وہ اپنی داستان سنا کر خاموش ہو جاتا ہے۔

اور کوئی ہے ؟ چار جاپانی قیدی۔ انھیں اندر لے آؤ۔ درد کے رشتے میں کوئی کسی کا دشمن نہیں ہوتا۔ کاٹ ڈالو، ان کی خون سے بھری ہوئی وردیاں، جو ان کے جسم سے گوند کی طرح چپکی ہوئی ہیں۔ خون کا بہاؤ بند کرو، اور اس کو دوسروں کے ساتھ لٹا دو۔ کیوں نہیں، یہ تو بھائی بھائی ہیں۔ کیا یہ سپاہی پیشہ ور آدم خور ہیں ؟ نہیں یہ تو ہتھیاروں سے نئے نئے آشنا ہوئے ہیں۔ ان کے ہاتھ محنت کشوں جیسے ہیں۔ دراصل یہ وردیوں میں ملبوس محنت کش ہیں۔

اب کوئی نہیں رہا۔ صبح کے چھ بج چکے ہیں۔ خدایا! بڑی ٹھنڈ ہے اس کمرے میں۔ دروازہ کھولو! دور گہرے نیل گوں پہاڑ نظر آ رہے ہیں، ان کے مشرق میں ہلکی ہلکی روپہلی کرن پھوٹ رہی ہے۔ ایک گھنٹے میں سورج نکل آئے گا، بستر پر سو جاؤں۔

مگر نیند نہیں آئے گی۔ اس حماقت اور بربریت کی کیا وجہ ہے ؟ دس لاکھ جاپانی مزدور دس لاکھ چینی مزدوروں کو قتل یا ملیامیٹ کرنے آئے ہیں۔ جاپانی مزدور اپنے بھائی مزدور پر جو اپنا دفاع کرنے پر مجبور ہے، حملہ کیوں کرتا ہے ؟

کیا جاپانی مزدور کو چینی مزدور کی موت سے کچھ فائدہ پہنچے گا ؟ نہیں اسے کیا فائدہ پہنچے گا۔ پھر خدا کے واسطے بتاؤ کون فائدہ اٹھا رہا ہے ؟ کون جاپانی مزدوروں کو اس قاتلانہ مشن پر بھیج رہا ہے ؟ کون اس سے فائدہ اٹھائے گا ؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ جاپانی مزدور کو اس بات پر آمادہ کیا گیا ہو کہ وہ چینی مزدوروں پر حملہ کرے جو خود اس کے افلاس اور مصائب کا رفیق ہے۔

کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ چند امیر لوگوں کا ایک چھوٹا سا گروہ، دس لاکھ غریب افراد کو ـــــ دوسرے غریب افراد پر جو کہ انھیں کی طرح غریب ہیں، حملہ کرنے اور تباہ کرنے پر اکسایا گیا ہو، اس لئے کہ امیر لوگ اور زیادہ امیر ہو جائیں؟ کتنی خوفناک سوچ ہے! انھوں نے ان لوگوں کو چین آنے پر کس طرح اکسایا ؟ کیا انہوں نے ان کو سچی بات بتائی تھی۔ نہیں، اگر انھیں اصل بات معلوم ہوتی تو وہ کبھی نہ آتے۔ کیا وہ ان محنت کشوں کو یہ بتانے کی جرأت کر سکتے تھے کہ امیر لوگ صرف سستا خام مال، زیادہ منڈیاں اور زیادہ نفع حاصل کرنا چاہتے ہیں ؟ نہیں، انھیں تو یہ بتایا گیا ہو گا کہ یہ خونخوار جنگ "نسل کے مستقبل"، "شہنشاہ کی عظمت" اور ملک کے وقار" کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ یہ سب کچھ "بادشاہ اور ملک" کے لئے کیا جا رہا ہے۔ جھوٹ ـــــ سفید جھوٹ

اس جیسی جارحانہ، مجرمانہ جنگ بھڑکانے والوں کو دوسرے مجرموں، قاتلوں اور دوسرے مجرموں میں شمار کرنا چاہیئے، جو کہ ان جرائم سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کیا آٹھ کروڑ جاپانی مزدوروں، غریب کسان، بے روزگار صنعتی مزدوروں کو کچھ فائدہ پہنچا ؟ جارحانہ جنگوں کی پوری تاریخ میں میکسیکو پر اسپین کی فتح میں، ہندوستان پر انگریزوں کی لوٹ میں یا ایتھوپیا میں اٹلی کی لوٹ کھسوٹ سے کبھی ان "فاتح" ممالک کے مزدوروں کو فائدہ پہنچا ہے ؟ نہیں، انھیں ایسی جنگ سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

کیا جاپانی مزدوروں کو اپنے ملک کے قدرتی وسائل، اپنے سونے، چاندی، فولاد، کوئلے یا تیل سے کچھ فائدہ پہنچا ہے ؟ نہیں، وہ ان سے بہت عرصہ پہلے ہی ہاتھ دھو چکے ہیں۔ وہ اب امیروں یعنی حکمران طبقے کی ملکیت ہیں۔ لاکھوں افراد جو ان کانوں میں کام کرتے ہیں غربت اور افلاس کی زندگی بسر کرتے ہیں تو پھر ان لوگوں کو چین کے سونے چاندی تیل کی مسلح چوری وغیرہ سے کیسے فائدہ پہنچے گا۔ کیا ایک ملک کے امیر لوگ دوسرے ملک کی دولت اپنے پاس نہیں رکھ لیتے، کیا وہ ہمیشہ سے ایسا نہیں کرتے آئے ہیں تو پھر یہ بات صاف ظاہر ہے کہ صرف جاپانی جنگ پرست اور سرمایہ دار طبقہ ہی اس قتل عام اور وحشیانہ بربریت سے فائدہ اٹھائے گا۔ تو اس لحاظ سے وہ مقدس جلاد، یعنی حکمران طبقہ ہی، جو کہ ریاست کا دوسرا نام ہے، اصل مجرم ہے۔

کیا جارحیت کی جنگیں، نو آبادیوں کی تسخیر کی جنگیں صرف "بڑوں" سے تعلق رکھتی ہیں۔ درحقیقت بات تو ایسی ہی لگتی ہے، چاہے قومی جرائم کرنے والے لوگ خوش نما تصورات اور خیالات کی آڑ میں اپنے جرائم کو چھپانے کی کتنی ہی کوششیں کریں۔ وہ قتل عام کر کے منڈیوں پر قبضہ کرنے اور لوٹ کھسوٹ کر کے خام مال حاصل کرنے کے لئے جنگ شروع کرتے ہیں۔ وہ تبادلے کے بجائے چوری کو سستا سمجھتے ہیں اور خریدنے کی بجائے قتل عام کو آسان سمجھتے ہیں یہی تمام جنگوں کا راز ہے ـــــ منافع۔ تجارت۔ خونی روپیہ۔

اس بربریت کی وجہ وہ خوفناک، خونی اور ظالم خدا ہے، جس کو "منافع" کہا جاتا ہے۔ روپیہ ایک لالچی بلا کی طرح ہے، جو کہ اپنا سود مانگ رہی رہتا ہے۔ اور اپنی ہوس پوری کرنے کے لئے کسی حد پر نہیں رکتا، چاہے اسے لاکھوں کا خون کیوں نہ پینا پڑے۔ فوج کے پیچھے جنگ پرست اور جنگ پرستوں کے پیچھے خزانے کا سرمایہ اور سرمایہ دار ہوتے ہیں ـــــ خونریزی میں ایک دوسرے کے شریکِ کار، جرائم میں ایک دوسرے کے ساجھے دار۔

یہ نسل انسانی کے دشمن شکل و صورت میں کیسے ہیں ؟ کیا ان کی پیشانیوں پر کچھ لکھا ہوتا ہے کہ ہم اس کو پڑھ کر ان مجرموں کو شناخت کر لیں اور پھر ان کی مذمت کریں۔ نہیں! بلکہ اس کے برعکس یہ لوگ بہت عزت مندوں میں سے ہیں اور شرفاء میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ خود کو معزز کہتے ہیں۔ اور دوسروں سے بھی کہلواتے ہیں۔ یہ اس لفظ کی کتنی بڑی توہین ہے۔ یہ لوگ ریاست، کلیسا اور معاشرے کے ستون ہیں۔ وہ اپنی فاضل دولت سے نجی اور عوامی خیراتی کاموں میں مدد کرتے ہیں۔ اور اداروں کی سرپرستی کرتے ہیں وہ اپنی نجی زندگی میں کریم النفس اور مہربان ہوتے ہیں۔ یہ قانون کا، اپنے قانون کا، ملکیت کے قانون کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن ایک علامت ایسی ہے جس کے ذریعے یہ معزز جنگ باز پہچانے جا سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ ذرا سا ان کے منافع میں کمی کرو اور پھر دیکھو گے کہ ان کے اندر کا درندہ غراتا ہوا جاگ اٹھے گا۔ وہ وحشیوں کی طرح ظالم، پاگلوں کی طرح خوفناک اور جلادوں کی طرح بے رحم ہو جاتے ہیں۔ جب تک یہ لوگ زندہ ہیں اس وقت تک اس دنیا میں مستقل امن قائم نہیں ہو سکتا۔ انسانی سماج کی اس تنظیم کو جو انہیں زندہ رہنے کی اجازت دیتی ہے، لازمی طور پر فنا کر دینا چاہیئے۔

یہی لوگ زخموں کے خالق ہیں۔

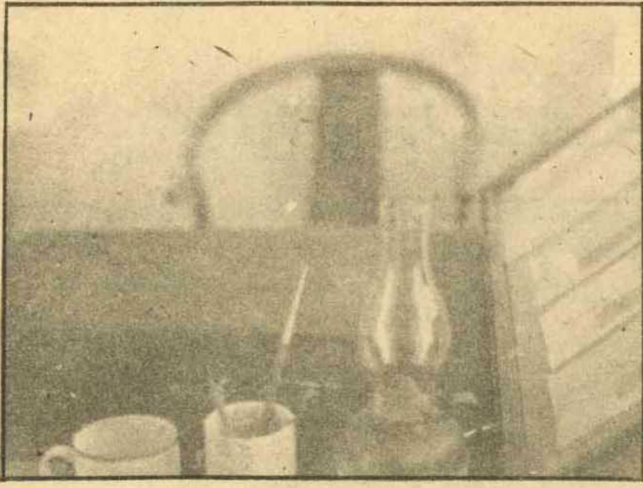
لانگ مارچ میں حصہ لینے والے ایک سپاہی کے تاثرات

ہمیں اپنی بیلٹوں کا چمڑا اُبال کر کھانا پڑا





صدر ماؤ اور کامریڈ کھانگ شنگ کی ایک نادر تصویر



چاؤ یوان میں صدر ماؤ کی میز

سابق رجمنٹ کمانڈر ۵۴ سالہ چوشاؤ چھن بھی بریگیڈ ۳۵۹ کے ان ارکان میں سے ہیں جو سنکیانگ کو آزاد کرانے کے بعد مستقل طور پر نان نی وان میں آباد ہو گئے۔ انہیں نان نی وان کی پوری تاریخ یاد ہے۔ ان کی گفتگو میں نان نی وان کے ذرے ذرے سے محبت کا جذبہ ٹپکتا ہے۔

کامریڈ چوشاؤ چھن صدر ماؤ کے صوبے، ہونان کے رہنے والے ہیں۔ وہ لانگ مارچ میں حصہ لے چکے ہیں، اس لئے میں نے یہ ضروری سمجھا کہ لانگ مارچ کے بارے میں ان کے تاثرات معلوم کروں۔

چوشاؤ چھن اس وقت سترہ، اٹھارہ سال کے تھے۔ وہ ہونان میں ہی سرخ فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ لانگ مارچ کے دوران جب سرخ فوج ان کے صوبے سے گزری تو وہ بھی اس میں شامل ہو گئے۔ چوشاؤ چھن کا ایک ہاتھ گولی لگنے کے باعث بیکار ہو گیا تھا، جو اب تک ٹیڑھا ہے۔



لانگ مارچ کے ایک ہیرو کامریڈ چوشاؤ چھن کے ساتھ

میری درخواست پر انھوں نے مختصر طور پر لانگ مارچ کے سب سے کڑے مرحلے کے بارے میں اپنے تاثرات بتائے۔

"دریائے چن شا کو عبور کرنا لانگ مارچ کے مشکل ترین مرحلوں میں سے ایک تھا۔ کومنتانگ کی افواج برابر ہم پر یلغار کر رہی تھیں۔ بعض اوقات دریا کے کنارے پر ہمارا قبضہ ہو جاتا اور بعض اوقات کنٹرول ان کے ہاتھ میں آ جاتا۔ اسی طرح یہ آنکھ مچولی جاری رہی۔ آخر ہم نے اپنی فوجوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ اور اس طرح کومنتانگ کی افواج کا زور گھٹ گیا۔ ہم دریا کو عبور کر کے دوسری طرف جانا چاہتے تھے، اور کومنتانگ کی کوشش یہ تھی کہ وہ ہمیں دریا عبور نہ کرنے دے، اور چن چن کر ہمیں ہلاک کر دے۔ دریا کے اس طرف بہت سارے درخت اُگے ہوئے تھے۔ ہمارے سپاہیوں نے درختوں کو کاٹ کر اس کے گٹھر بنائے اور اسے کشتی کے طور پر استعمال کرتے ہوئے دریا پار کرنے لگے۔ وہ ایک ہاتھ سے گٹھر کو پکڑتے تھے اور دوسرے ہاتھ سے تیرتے تھے۔ اوپر سے کومنتانگ کے ہوائی جہاز اور نیچے سے اس کی توپیں ہم پر آگ اگل رہی تھیں، لیکن ہم نے کوئی خاص نقصان اٹھائے بغیر دریا کو پار کر لیا۔ چن شا کو عبور کرنے کے بعد ہم سیکانگ کے صوبے میں پہنچے۔ یہاں ایک اونچا برف پوش پہاڑ ہمارے عزائم کا امتحان لینے کے لئے سر اٹھائے کھڑا تھا۔ سردی زوروں پر تھی۔ ہمارے پاس پوری طرح گرم کپڑے بھی نہیں تھے۔ اس لئے ہم نے برف پوش پہاڑ پر چڑھائی کے دوران سردی کا مقابلہ کرنے کے لئے پہلے ہی اپنے پاس مرچیں جمع کر لیں۔ جب ہم نے چڑھائی شروع کی تو ان مرچوں نے اکسیر کا کام دیا۔ تھکن اور سردرد کو ختم کرنے کے لئے بھی ان کا استعمال فائدہ مند ثابت ہوا۔ اوپر ہوا بہت کم تھی۔ سر بھاری محسوس ہوتا تھا یوں لگتا تھا کہ بس اگلے قدم پر دم نکلنے والا ہے۔ ایک دفعہ گر کر اٹھنا مشکل ہو جاتا۔ قدم من من بھر کے ہو گئے تھے۔ ہمارے بہت سے کامریڈ اس برف پوش پہاڑ کو عبور کرنے کے دوران ہلاک ہوئے۔ زخمیوں کے علاج کے لئے ادویات کی کمی تھی۔ بہت سے سپاہی دوا نہ ملنے کے باعث بھی ہلاک ہوئے۔ بہر حال ہمارے دل میں یہ جذبہ موجزن تھا کہ ہمارا یہ مارچ ہمیں آزادی کی منزل کی طرف بڑھا رہا ہے۔ اس لئے ہم نے اس کڑے مرحلے کو بھی طے کر لیا۔

اسی طرح گھاس کے میدان عبور کرتے وقت بھی ہمیں قدم قدم پر موت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ میدان ویران تھے۔ کہیں کہیں جنگلی سبزیاں اُگی ہوئی تھیں۔ ہمارے پاس خوراک نہیں تھی، اس لئے ہمیں مجبوراً جنگلی سبزیوں اور گھاس پر گزارہ کرنا پڑا۔ لیکن بعض علاقوں میں دور دور تک گھاس بھی نہیں ملتی، اس لئے ہمیں اپنی بیلٹوں کا چمڑا اُبال کر کھانا پڑتا۔ خوراک کی کمی کی وجہ سے سپاہیوں کا وزن گھٹنے لگا۔ ہم نے اس میدان کو پار تو کر لیا، لیکن اس وقت تک ہمارے بیشتر سپاہی سوکھ کر کانٹا ہو چکے تھے۔

جب ہم اقلیتی قومیتوں کے علاقوں سے گزرتے تھے تو ہماری مشکلات میں اور اضافہ ہو جاتا۔ قومیتوں کے عوام آئے دن کومنتانگ کی افواج کے مظالم کا شکار ہوتے رہتے تھے، اس لئے انھیں باہر سے آنے والوں پر بھروسہ نہیں ہوتا تھا۔ شروع شروع میں وہ ہم سے بیزاری کا اظہار کرتے اور دور دور رہتے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم بھی ان کے گھروں کو لوٹیں گے اور ان کی عورتوں کی عزت پر ہاتھ ڈالیں گے۔ لیکن ہماری فوج کا ڈسپلن بہت پختہ تھا۔ ہم بھوکے مرجانا پسند کر لیتے، لیکن عوام سے اناج کا ایک دانہ تک لینا گوارہ نہ کرتے۔ ہر چیز کی قیمت ضرور ادا کرتے۔ بعد میں وہ ہمارے سلوک سے متاثر ہو کر ہمارے قریب آ جاتے، اور ہمیں آرام پہنچانے کی کوشش کرتے۔ لیکن ہم ان پر کسی قسم کا بوجھ نہیں ڈالتے تھے۔ ان کے اصرار کے باوجود ہم ان کے مکانات میں نہیں سوتے تھے۔ بارش کے دوران بھی ہم کھلے آسمان کے نیچے یا پیڑوں اور دیواروں کی آڑ میں سو جاتے۔ رات بھر مچھر ہمیں ستاتے رہتے، لیکن ہم میں سے کسی کے دل میں یہ خواہش پیدا نہ ہوتی کہ وہ کسی کے مکان کے اندر جا کر سو جائے۔ بعض اوقات قومیتوں کے سردار ہمارے افسروں کو زبردستی کھینچ کھانچ کر اپنے مکان میں لے جاتے۔ صوبہ کانسو میں ہوئے (مسلم) قومیت کے علاقے میں شروع شروع میں ہمیں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہاں کے عوام ہم سے دور بھاگتے تھے، لیکن جب انھیں تجربے سے یہ معلوم ہو گیا کہ ہم عوام کے غمگسار ہیں اور انہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاتے تو وہ ہم میں گھل مل گئے۔ اور جب ہم کانسو سے روانہ ہونے لگے تو وہاں کے بہت سے نوجوان ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔

ہمارے سپاہی جس علاقے میں قیام کرتے وہاں کے عوام کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے۔ یہی وجہ تھی کہ لانگ مارچ کے دوران سرخ فوج جن گیارہ صوبوں سے گزری، وہاں کے عوام دل سے ہمارے ساتھ ہو گئے۔ انھیں پتہ چل گیا کہ کومنتانگ اور کمیونسٹوں کی فوجوں میں کیا فرق ہے —— کومنتانگ کے سپاہی کلف لگی وردیاں پہنتے تھے، اور ہمارے اکثر سپاہیوں کی وردیاں پھٹ کر چیتھڑوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ کومنتانگ کے افسر مقامی لوگوں اور اپنے سپاہیوں کو حقیر سمجھتے تھے، اور ہمارے افسران سے محبت کرتے تھے، اور ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے۔ وہ عام سپاہیوں کی طرح رہتے تھے۔ انہی جیسی وردیاں پہنتے تھے، انہی جیسا کھانا کھاتے تھے۔ انہی کی طرح بھوکے رہتے تھے اور انہی کی طرح محنت میں حصہ لیتے تھے۔"

گیارہ صوبوں کے عوام ہمارے دوست بن گئے

کامریڈ چوشاؤ چھن کے ساتھ تصویر کھنچوانے کے بعد ہم نان نی وان سے واپس آ گئے۔

۹ اگست کو صبح نو بجے ہم ینان کے علاقے چاؤیوان (کھجور کا باغ) میں صدر ماؤ کی رہائش گاہ دیکھنے گئے۔ یہاں پھلوں کے بہت سے باغات ہیں، جس کی وجہ سے اسے چاؤیوان (پھلوں کا باغ) کہا جاتا ہے۔ چین کے ممتاز لیڈر کامریڈ کھانگ شنگ نے اسے یان یوان کا نام دیا تھا۔

۱۹۴۳ء کے اواخر میں صدر ماؤ یان چیالنگ کی رہائش گاہ سے یہاں منتقل ہوئے تھے۔ یہاں انھوں نے "تحریکِ اصلاح" اور پیداواری مہم کی نگرانی کی تھی۔ ساتویں کانگریس میں پیش کردہ تینوں رپورٹیں انھوں نے یہیں تیار کی تھیں۔ ان رپورٹوں میں انھوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ عوام کو مسلح جدوجہد کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ یہیں سے وہ چیانگ کائی شیک کے ساتھ چھونگ چھینگ (CHUNGKING) مذاکرات میں حصہ لینے گئے تھے۔

۱۹۴۵ء میں جب چیانگ کائی شیک نے ہمہ گیر جنگِ مزاحمت کا آغاز کیا تھا، اس سے کچھ عرصہ قبل وہ چاؤیوان کی رہائش گاہ سے وانگ چیا پھینگ منتقل ہو گئے۔

چاؤیوان میں صدر ماؤ نے کل ۲۸ مضامین لکھے۔ جو منتخباتِ ماؤزے تنگ میں شامل ہیں۔ ان مضامین میں "مخلوط حکومت کے بارے میں، معاشی کام سیکھنا چاہیے، منظم ہو جاؤ، جنگِ مزاحمت میں فتح کے بعد صورتِ حال، چھنگ چھینگ مذاکرات کے بارے میں، عوام کی خدمت کرو، بیوقوف بوڑھا جس نے پہاڑ ہٹا دیئے، شمالی مشرقی اڈوں کو مستحکم کرنے کی جدوجہد، جاپانی جارحین کے خلاف آخری لڑائی، مطالعہ اور صورتِ حال زیادہ مشہور ہیں۔

اس زمانے میں یہاں کاغذ کی شدید قلت تھی۔ سرخ فوج کے کارکن "مالان" نامی گھاس سے ایک خاص قسم کا کاغذ تیار کرتے تھے۔ صدر ماؤ نے یہاں اپنے تمام مضامین اسی کاغذ پر تحریر کئے تھے۔ لکھتے وقت وہ پنسلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو بھی ضائع نہیں جانے دیتے تھے۔ ان کی میز کے پاس لوہے کی ایک چوڑی پٹی رکھی ہوئی تھی۔ جب وہ تھک جاتے تو اسے ہاتھ میں لے لیتے، تاکہ ہاتھ کا پسینہ اور ٹھنڈک کا اثر ختم ہو جائے۔ جب وہ کسی کو خط لکھتے تو کفایت کے لئے استعمال شدہ لفافے استعمال کرتے تھے۔ ایک بار ان کے گارڈوں نے کمرے کو گرم کرنے کے لئے بہت زیادہ کوئلہ جلا دیا۔ صدر ماؤ ان پر بہت ناراض ہوئے۔ انہوں نے ان سے پوچھا "تمہیں معلوم ہے کوئلہ کہاں سے آتا ہے؟" گارڈوں نے جواب دیا "درختوں کی لکڑیوں سے۔" صدر ماؤ نے کہا "تم نے ٹھیک کہا، لیکن ان درختوں کو اگانے کے لئے کسان اپنا خون پسینہ ایک کرتے ہیں، ہمیں اس کا استعمال اس بے دردی



«عوام کی خدمت کرو» صدر ماؤ نے یہ تقریر اس پلیٹ فارم پر کی

سردی کا مقابلہ کرنے کے لئے مرچوں نے اکسیر کا کام کیا

سے نہیں کرنا چاہیئے"!

چاؤیوان کی رہائش گاہ بھی، صدر ماؤ کی دوسری رہائش گاہوں کی طرح بہت سادہ ہے۔ ایک کمرے میں چھوٹی سی بدنما سی میز رکھی ہوئی ہے، جس پر لکھنے پڑھنے کا سامان رکھا ہوا ہے۔ کرسی دقیانوسی طرز کی ہے۔ دوسرے کمرے میں سونے کے لئے پلنگ رکھا ہوا ہے، جس پہ تختے جڑے ہوئے ہیں پیچھے کتابوں کا شیلف ہے۔ دیواروں پر سفید پلستر چڑھا ہوا ہے، فرش کچا ہے۔

چاؤیوان کی رہائش گاہ سے کچھ فاصلے پر دہ پلیٹ فارم ہے جہاں صدر ماؤ نے ایک شہید کی یاد میں ایک تقریر کی تھی، جو "عوام کی خدمت کرو" کے عنوان سے "منتخبات ماؤزے تنگ" میں شامل ہے۔ سرخ فوج کا ایک گارڈ، چانگ شیہہ تیہہ کوئلے کی بھٹی میں جل کر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کی یاد میں ۸ ستمبر کی سہ پہر کو ایک تعزیتی میٹنگ ہوئی جس میں ایک ہزار افراد شریک ہوئے۔ صدر ماؤ نے اپنی تقریر میں لوگوں سے یہ کہا کہ عوام کے لئے جان دینا سب سے افضل موت ہے۔ پلیٹ فارم پر ایک بڑا سا بورڈ لگا ہوا ہے، جس پہ صدر ماؤ کی یہ تقریر لکھی ہوئی ہے

چاؤیوان میں ہی مرکزی کمیٹی کے سیکرٹریٹ کا میٹنگ ہال ہے۔ اگست ۱۹۴۵ء کے اواخر میں کمیٹی کا توسیع شدہ اجلاس اس ہال میں منعقد ہوا تھا، جس میں چھنگ چھنگ (CHUNG KING) مذاکرات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس میٹنگ کے بعد صدر ماؤ چھنگ چھنگ مذاکرات میں حصہ لینے گئے۔ جب وہ ینان واپس آئے تو پارٹی کے ممتاز لیڈروں نے ہوائی اڈے پر ان کا استقبال کیا۔ ہال میں اس موقع کی ایک تصویر لگی ہوئی ہے، جس میں صدر ماؤ انگریزی ہیٹ پہنے ہوئے ہیں، اور پرانے طرز کے طیارے کی سیڑھیوں پر کھڑے ہاتھ ہلا رہے ہیں۔



پیشے کے انتخاب کے بارے میں ایک نوجوان کے خیالات

کارل مارکس

ترجمہ: الطاف خان

عظیم انقلابی مفکر کارل مارکس نے یہ سطور صرف سترہ سال کی عمر میں لکھی تھیں۔ انہیں پڑھنے کے بعد یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کارل مارکس نوعمری میں ہی کتنا بلند سیاسی شعور رکھتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے دل میں عوام کی خدمت کا جذبہ موجزن تھا۔ یہ سطور پاکستان کے نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں، کہ وہ اپنے پیشے کا انتخاب کرتے وقت زندگی کے لازوال اصولوں کا انتخاب کریں۔ ملک کے موجودہ سیاسی حالات میں اپنے ذاتی مفادات کی بجائے اجتماعی مفادات کے لئے کام کریں، تاکہ "ان کی راکھ پر شریف النفس انسانوں کے گرم آنسوؤں کا چھڑکاؤ ہوتا رہے!" ——— (ادارہ)

اپنے ذاتی مفادات یا مادی منفعت کی بنیاد پر کسی پیشے کا انتخاب ایک قابلِ مذمت فعل ہے۔ تاریخ ان لوگوں کو عظیم ترین شخصیت قرار دیتی ہے جو عوام کے وسیع مفادات کے لئے کام کرتے ہوئے اپنی اصلاح کرتے ہیں۔ تجربہ یہ بتایا ہے کہ جن لوگوں نے عوام کے وسیع حلقے کے لئے خوشیاں فراہم کی ہیں، وہ سب سے زیادہ خوش نصیب ہے۔ انسانیت کی خدمت کرنے اور دنیا بھر کے لوگوں کو کریم النفس بنانے کے عمل کو ہی اپنا فرض اور زندگی کی خوشی سمجھنا چاہیئے۔

لیکن کسی پیشے کے انتخاب کا انحصار صرف فرد کی کوششوں پر نہیں ہوتا۔ ہم ہمیشہ وہ مقام نہیں حاصل کر سکتے، جس کا کہ خود کو مستحق سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے سماجی رشتے کسی حد تک پہلے ہی سے متعین ہونا شروع ہو جاتے ہیں، قبل اس کے کہ ہم خود اس حیثیت میں ہوں کہ ان کا تعین کر سکیں۔ انسانوں کے ان سماجی رشتوں کی اہمیت اکثر و بیشتر ہم میں سے چند لوگوں کو اس زندگی کی طرف لے جاتی ہے، جو ہمارے انتخاب میں شامل نہیں ہوتی۔

اگر ہم نے ایسے کام کا انتخاب کیا جس کے ذریعے ہم نوعِ انسانی کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں تو پھر ہمیں کوئی مشکل اپنے آگے نہیں جھکا سکتی، کیونکہ یہی وہ قربانیاں ہیں جو سب کے لئے ہوتی ہیں۔ اس طرح ہماری مسرت حقیر، محدود اور انانیت پسندانہ نہیں ہوتی، کیونکہ ہماری مسرت کروڑوں افراد کی مسرت ہوتی ہے۔ ہمارے کارنامے ابد تک زندہ رہتے ہیں اور ہماری راکھ پر شریف النفس انسانوں کے گرم آنسوؤں کا چھڑکاؤ ہوتا رہتا ہے۔



سید عبدالحمید عدمؔ

سیپ — اس فلسفے کا حامی ہے
زندگی — ایک تِشنہ کامی ہے

کیا یہ نیکی بھی۔ ڈر جھجک کے کریں
کیا محبت بھی ایک۔ خامی ہے

پھول خود باغباں نے۔ توڑے ہیں
کتنی عمدہ — خوش انتظامی ہے

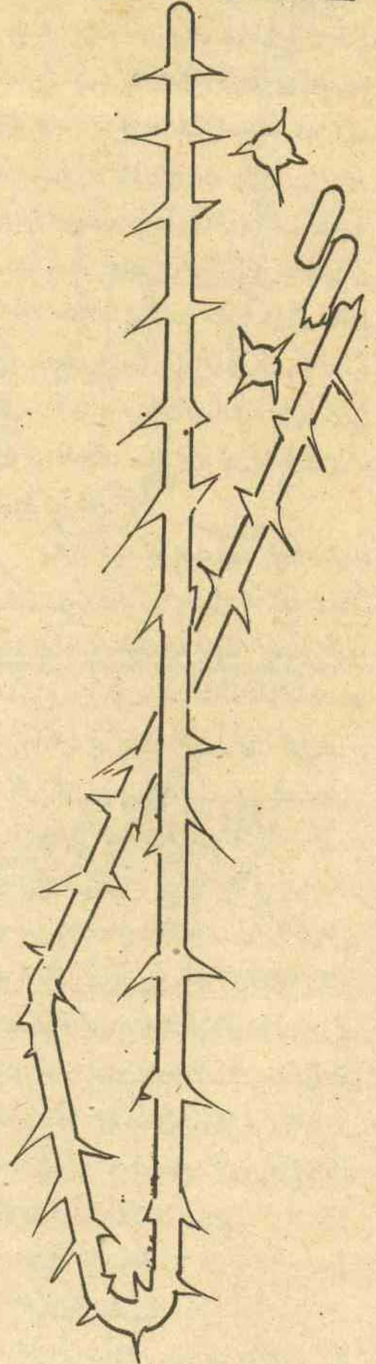
جس نے دیکھا ہے تیری زلفوں کو
اس کی آشفتگی — دوامی ہے

صرف سچ بولنے کا — مُجرم ہوں
اور بھی مجھ میں — کوئی خامی ہے؟

سولی چڑھنے سے — جھینپنا کیسا؟
یہ تو دلدار کی — سلامی ہے

بادشاہت کا — کیا چراغ جلے؟
روشنی کی قبا — عوامی ہے

جس کو دیکھا نہیں — کسی نے عدمؔ
خضر — وہ صورت گرامی ہے



بھوک، بیٹا اور قبر

ہر وہ راستہ جہاں سے پیسے ملنے کی امید تھی بند ہو چکا تھا۔ رحمت علی پرچون والے نے جب ادھار دینے سے انکار کیا تو ناشاد احمد کی تمام امیدیں پرانی قبروں کی طرح ڈھ گئیں۔ وہ خاموشی سے گردن جھکائے قبرستان کی طرف چل پڑا۔ اسلامیہ پارک کی اس لمبی سڑک پر بے پناہ ٹریفک کے باوجود اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بالکل تنہا ہے۔

ناشاد احمد نے جب ہوش سنبھالا تو اس نے اپنے اردگرد لاتعداد قبریں پائیں۔ کچھ شکستہ اور کچھ محلوں کی طرح خوبصورت۔ اس عمر کا بچہ قبرستان سے خوف کھاتا ہے پہلے پہل تو ناشاد کے دل میں بھی نیزے گاڑ ہے۔ رات کو الو کی چیخیں اس کے خوف کی چیخیں بن جاتیں۔ لیکن جب اسے پتہ چلا کہ قبرستان ہی اس کی شاہی ہے۔ تو ذہن سے ڈر اور خوف کا ہر سایہ دم توڑ گیا۔ اب تو وہ اکثر رات کے بارہ بجے تک راڈو سے آنکھ مچولی کھیلتا۔ راڈو جو اس کی طرح ہی ایک گورکن کی بیٹی تھی۔ مگر بلا کی حسین، موٹی موٹی بیروں جیسی آنکھیں، گندم سا رنگ، ککڑی کی طرح نرم و نازک بانہیں، جب اس کے گلے کا ہار بنتی تو ناشاد کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ برف میں لگی ہوئی گنڈیری چوس رہا ہے۔ مگر یہ خوشی کچھ عرصہ ہی رہی۔ راڈو جب جوان ہوئی تو کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ مگر ناشاد کا دل اب تک نہیں مانتا کہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ ضرور اسے کسی نے ورغلایا ہے۔ ورنہ وہ تو اس سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔

ناشاد کا باپ اس قبرستان کا ایک حصہ بنا تو اس کی وراثت میں اسے کدال اور تیشہ ملا جس کے ذریعہ سے وہ پچھلے سات سال سے قبریں کھود رہا ہے۔ اس اثناء میں اس نے لاتعداد قبریں کھودیں۔ غریبوں کی بھی اور امیروں کی بھی۔ جو اُن کے محلوں کی طرح خوبصورت ہیں۔ ان قبروں کو دیکھ کر وہ جھنجھلا اٹھتا ہے۔ غریبوں کو یہاں دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں ہے، اور یہ قبروں پر سنگ مرمر چڑھاتے ہیں۔ شاید باہر کی دنیا میں جو فرق ہے وہ سرمایہ دار اس جہان میں بھی برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ ڈائنامائیٹ لگا کر ان قبروں کو اڑا دے مگر بے بس ہو کر وہ یوں اپنی تسلی کرتا کہ سب قبروں کی زمین تو ایک ہی ہے۔ ان قبروں میں اس کی بیوی کی قبر بھی ہے۔ جو اس کے تخت کا ایک وارث پیدا کر کے مر گئی۔ مر تو وہ اس دن گئی تھی جب شادی کی بیل گاڑی نے اسے لائل پور کے اجاڑ قبرستان سے لاہور کے اس وسیع قبرستان کے بیچ کھڑا کر دیا تھا۔ وہ ہزاروں خواہشوں اور آرزوؤں کے ساتھ ڈولی میں بیٹھی ہوگی۔ مگر یہاں اسے فاقے سے اصلی ٹی بی جیسی غریبوں کی پسندیدہ بیماری ملی۔ مگر اس نے ایک سال جینا تھا۔ تخت کا ایک وارث پیدا کرنا تھا۔ یہ اس کا فرض تھا اور جس دن اس نے یہ فرض پورا کیا، دم توڑ گئی۔ ان قبروں میں اس کے بچے کی قبر بھی ہے۔ جسے وہ تین سال تک پالتا رہا۔ مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا کہ سات پشتوں کی یہ شاہی چلتی رہے۔ وارث نے دم توڑ دیا۔ اس دن وہ بہت رویا۔ بادشاہ وارث کی موت پر ایسے ہی روتے ہیں۔ وہ تو ان سے بھی زیادہ رونا چاہتا تھا مگر مردہ بو دینے لگ گیا۔ پھر اس نے قبر کھودی اور سات پشتوں کی بادشاہت کو دفن کر دیا۔

اسلامیہ پارک کی لمبی سڑک قبرستان میں داخل ہوئی اور وہ اپنی جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ دور سائیں کٹا شاہ کے ڈیرے سے قوالی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے غصہ سے تھوک باہر پھینکا۔ سائیں کتنا بڑا فراڈ ہے۔ ہر مہینے وہ اس کے لنگر کے لئے پیسے دیتا ہے جیسا کہ بزرگوں کی روایت ہے۔ اور آج اسے پیسے کی ضرورت تھی مگر سائیں کٹا شاہ نے انکار کر دیا۔ ہمارے دربار سے دعائیں ملتی ہیں یا مرادیں یا چرس۔ مگر ناشاد کو ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ اسے تو روٹی کھانے کے لئے پیسہ چاہیئے تھا۔ روٹی جو دو دن سے اس کے پیٹ میں نہیں گئی۔ جس کے لئے آج وہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہے۔ تنگی یوں تو پہلے بھی آتی تھی مگر ایسی تنگی پہلے کبھی نہیں آئی۔ آج ساتواں دن ہے کہ کوئی مردہ نہیں آیا۔ شاید شہر کے ڈاکٹر کہیں کوچ کر گئے ہیں۔ بھوک نے اس کے پیٹ میں کروٹ لی تو اس کی زبان سے دعا نکلی۔ دعا مانگ کر اسے کچھ سکون ملا۔ اور وہ زمین پر دراز ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک کار کے ہارن نے اسے چونکا دیا۔ وہ دوڑتا ہوا باہر آیا، سڑک پر ایک لمبی سی کار کھڑی تھی۔ لاٹھیوں سے ناپنے والی۔

"جی صاحب" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"ایک قبر کھود دو" کار میں سے آواز آئی۔

"بہت اچھا صاحب" اس کی آواز لرزنے لگی۔

"دیکھنا قبر سڑک کے کنارے ہو" کار سے آواز آئی۔

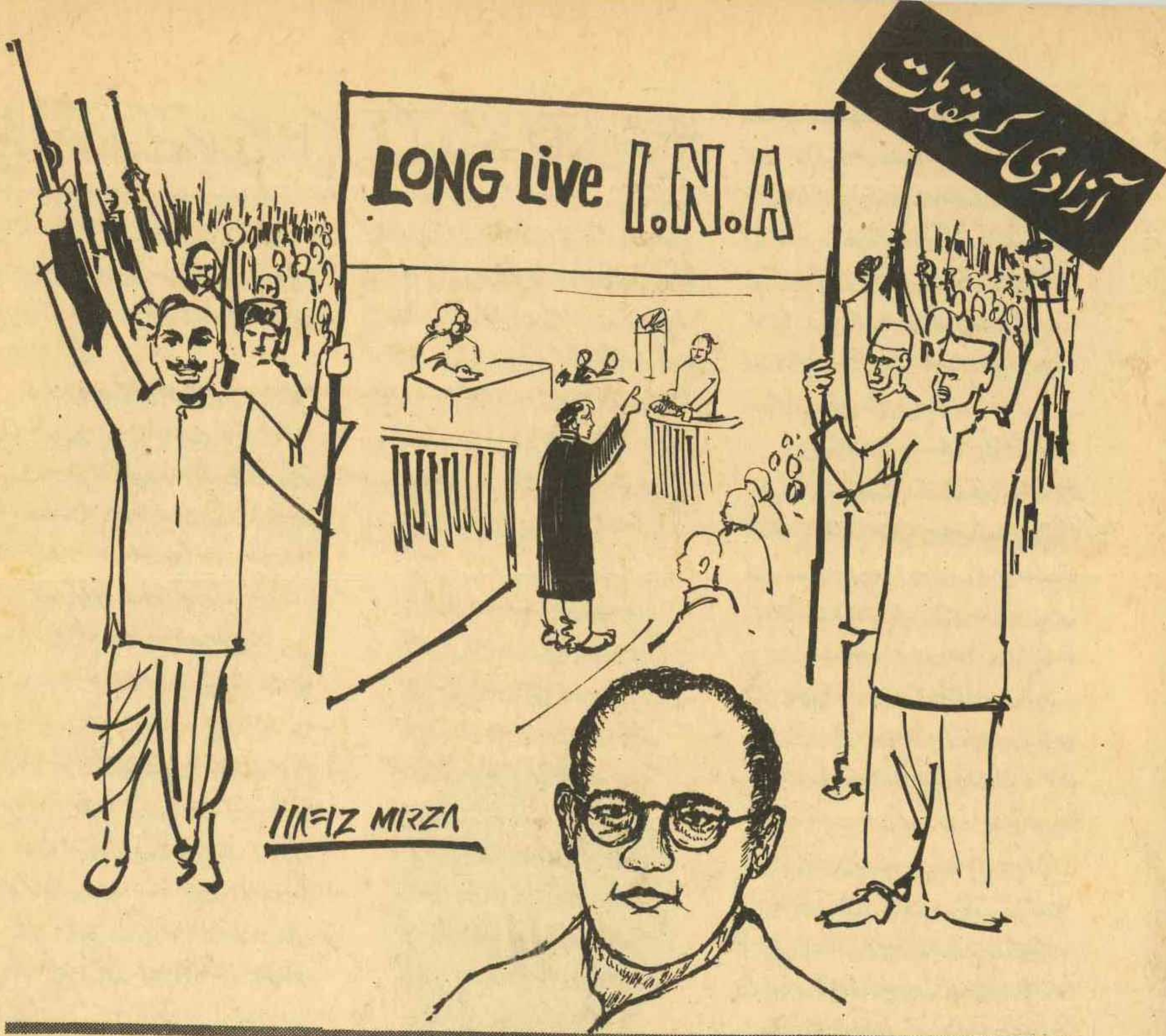
کار اس کے نتھنوں میں مٹی کے بادل چھوڑتی ہوئی چلی گئی۔ جب اس نے کدال اور تیشہ اٹھایا تو اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے خوشی کے سارے تاثرات مٹ گئے۔ سڑک کے کنارے تو کوئی جگہ خالی نہیں۔ وہ دھڑام سے اسی جگہ بیٹھ گیا۔ پھر اسے وہ ویران قبر یاد آئی جو سڑک کے کنارے پر ہے۔ ایک مدت سے اس قبر پر کوئی نہیں آیا۔ شاید اس کا کوئی وارث نہیں ہے۔ ایک دفعہ پھر اس پر خوشی نے حملہ کیا مگر جب وہ اس ویران قبر پر پہنچا تو وہاں ایک روشن دیا اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس کی ساری خوشی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ وہ مایوسی کے عالم میں واپس پلٹا، راستے میں اس کے بیٹے کی قبر تھی۔

"یہ بھی تو سڑک کے کنارے ہے" جیسے کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "یہ نہیں ہو سکتا" وہ بے ساختہ چلایا۔ بھوک نے پیٹ میں کروٹ بدلی۔ اذیت کی لکیریں اس کے چہرے پر پھیلیں۔ اس نے تیشہ اٹھایا اور زور سے قبر پر مارا۔ تیشہ چلنے کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر مٹی میں جذب ہوتے گئے۔ باپ بیٹے کے درمیان کا یہ آخری رشتہ مسمار ہو گیا۔ قبر تیار ہو گئی مگر آنسو نکلتے رہے جیسے آج ہی اس کے بیٹے نے دم توڑا ہو۔ کچھ عرصہ بعد کار آئی اور ایک نوجوان کار سے اترا۔ اس نے قبر کو اچھی طرح دیکھا۔ اردگرد کے ماحول پر ایک نگاہ ڈالی۔ اور کار میں بیٹھ گیا —— "جگہ تو اچھی ہے لیکن اردگرد کوئی درخت نہیں ہے دادا جان کو سایہ بہت پسند تھا" —— "کسی دوسرے قبرستان چلتے ہیں" دوسری آواز آئی اور کار فراٹے بھرتی نظروں سے غائب ہو گئی۔ ناشاد جیسے زمین میں گڑ گیا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے دائرے سے پھیلے۔

سرخ۔ سبز اور خاکی۔

بھوک، بیٹا اور قبر۔

اس نے تیشہ اٹھایا اور زور زور سے زمین پر مارنا شروع کر دیا ——



برطانیہ گاندھی سے کم اور سبھاش چندر بوس سے زیادہ خوفزدہ تھا

نعیم الحسن

۲۹ اپریل ۱۹۳۹ء کو سبھاش چندر بوس انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت سے مستعفی ہو گئے۔ برطانوی حکومت گاندھی جی سے اتنی خائف نہ تھی جتنی وہ سبھاش چندر بوس سے تھی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ بوس اہنسا اور شانتی کے راستے پر چل کر آزادی حاصل کرنے کے قائل نہ تھے۔ وہ تشدد اور مسلح جدوجہد پر پورا یقین رکھتے تھے اور اس کے ذریعہ وہ برطانوی سامراج سے ہندوستان کو نجات دلانا چاہتے تھے۔ سبھاش چندر بوس کو جولائی ۱۹۳۹ء میں گرفتار کیا گیا۔ نومبر ۱۹۴۰ء میں انہوں نے بھوک ہڑتال کر دی، برطانوی حکومت پریشان ہو گئی، چنانچہ انہیں رہا کر دیا گیا۔ جنوری میں بوس بڑے ڈرامائی انداز میں۔ ضیاء الدین خان کے بہروپ میں افغانستان پہنچ گئے۔ اس کے بعد وہ جرمنی پہنچے اور ہٹلر کے تعاون سے آزاد ہند فوج قائم کی۔ وہ جاپان بھی گئے۔ اور بھارت کی آزادی کے لئے ایک بڑی فوج تیار کی۔ بدقسمتی سے انہی دنوں جاپان کے دو شہر ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرایا گیا۔ جس کی وجہ سے جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اگر یہ حادثہ نہ ہوتا تو شاید سبھاش چندر بوس آزاد ہندوستان کے پہلے صدر ہوتے۔

ستمبر ۱۹۴۲ء میں آزاد ہند فوج کی بنیاد ڈالی گئی کیپٹن موہن سنگھ پر موٹروں میں سے ایک تھے۔ وہ میجر جنرل کی حیثیت سے آزاد ہند فوج کے کمانڈر بن گئے۔ تھوڑے عرصے کے بعد آزاد ہند فوج کی قیادت سبھاش چندر بوس نے سنبھال لی۔ ان کے احکامات کی روشنی میں آزاد ہند فوج نے جنگ لڑنی شروع کی اور کئی معرکوں میں فتوحات حاصل کیں۔ لیکن اچانک جنگ کی بلاخیزی جرمنی اور اس کے اتحادیوں کے خلاف ہو گئی۔

نئے حالات اور جنگی صورت حال کے سبب آزاد ہند فوج منی پور سے آگے نہ بڑھ سکی۔ جاپان نے شکست قبول کر لی

بیرونی تسلط سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد بغاوت نہیں ہے

آزاد ہند کے ہزاروں فوجیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ان میں سے بے شمار فوجیوں کو گولی مار دی گئی، سینکڑوں کو لیبر کیمپوں میں ڈال دیا گیا۔ اور بے شمار فوجیوں اور اعلیٰ افسران کا کورٹ مارشل کیا گیا۔

۵ر نومبر ۱۹۴۵ء کو لال قلعہ دہلی میں آزاد ہند فوج کے جن ممتاز افسران پر مقدمہ چلایا گیا، ان میں کیپٹن شاہ نواز لیفٹیننٹ ڈھیلن اور کیپٹن پریم کمار سہگل تھے۔ اس واقعہ سے ٹھیک ۸۰ سال قبل اسی جگہ مغلیہ خاندان کے آخری چشم و چراغ تاجدار دہلی بہادر شاہ ظفر پر مقدمہ چلایا گیا تھا اور انہیں تاحیات جلاوطنی کی سزا دی گئی تھی۔ ۵ر نومبر کو صبح نو بجے کورٹ مارشل کی کاروائی شروع کی گئی۔ یہ سات ارکان پر مشتمل تھی جس میں میجر جنرل اے ڈی بلیکسن لینڈ (صدر) بریگیڈیئر اے جے ایچ بروک لیفٹیننٹ کرنل سی پی اسکاٹ۔ ایم سی، لیفٹیننٹ کرنل ٹی آئی اسٹیونسن، لیفٹیننٹ کرنل ناصر علی خان، میجر پریتم سنگھ، میجر بنواری لعل، شامل تھے، استغاثہ کی نمائندگی ایڈووکیٹ جنرل سر این پی انجینئر نے کی جب کہ وکیل صفائی کے فرائض مسٹر ولبھ بھائی ڈیسائی نے ادا کئے۔ سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر کے این کاٹجو، رائے بہادر بدری داس، مسٹر آصف علی، کنور دلیپ سنگھ، بخشی ٹیک چند اور مسٹر پی کے سین نے وکیل صفائی کی معاونت کی۔

آزاد ہند فوج کے مذکورہ بالا افراد پر مندرجہ ذیل الزامات لگائے گئے۔

- ملزمان نے ستمبر ۱۹۴۲ء اور ۲۶ر اپریل ۱۹۴۵ء کے درمیانی عرصہ میں سنگاپور اور رنگون میں تاج برطانیہ کے خلاف جنگ کا آغاز کیا۔
- لیفٹیننٹ گربخش سنگھ ڈھیلن پر چار افراد ہری سنگھ۔ ڈلی چند، پرویو سنگھ اور دھرم سنگھ کے قتل کا الزام میں بھی لگایا گیا۔
- کیپٹن سہگل پر چار افراد کے قتل میں لیفٹیننٹ ڈھیلن کے ساتھ تعاون کرنے کا الزام عائد کیا گیا۔
- کیپٹن شاہ نواز پر بغاوت کے الزام کے علاوہ تین افراد خازین شاہ، آیا سنگھ اور بندو تچی محمد حسین کے قتل کا الزام بھی لگایا گیا۔

آزاد ہند کے تینوں افراد نے خوشگوار موڈ میں ان الزامات کو سنا اور اس کی صحت سے انکار کیا۔ مقدمے کی کاروائی ۱۲ر نومبر کو دوبارہ شروع ہوئی جس میں پہلے گواہ کا بیان قلمبند کیا گیا گواہ آزاد ہند حکومت کا ایڈووکیٹ جنرل تھا۔ اس نے آزاد ہند حکومت اور فوج کے طریقۂ کار اور سرگرمیوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ اس نے بتایا کہ آزاد ہند بنک میں تقریباً ایک کروڑ روپیہ محفوظ تھا۔ اور عطیات کی شکل میں فنڈ میں اضافہ کرنے کا سلسلہ جاری تھا۔ گواہ نے آزاد ہند فوج کا منشور بھی پیش کیا جس میں مختصراً کہا گیا تھا کہ۔

> شانتی اور صلح جوئی سے ہندوستان کی آزادی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ بھارتی رہنما اور عوام غیر مسلح ہیں، ایسی صورت میں یہ ذمہ داری انڈین انڈیپنڈنٹس لیگ پر عائد ہوتی کہ ایسے تمام محب وطن افراد کی حمایت سے جو اس وقت ہندوستان میں ہیں یا باہر ہیں۔ آزاد ہند کی عبوری حکومت قائم کرے اور آزاد ہند فوج کے تعاون سے برطانوی سامراج کے اقتدار کا خاتمہ کر دے۔ آزاد ہند کی عبوری حکومت ہر شہری کو مذہبی آزادی، مساوات اور روزگار میں برابری کے حقوق کی ضمانت دیتی ہے۔ اس لئے ہندوستان کے تمام شہریوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ آزاد ہند کے پرچم تلے آزادی کی انقلابی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیں۔ اور برطانیہ کے خلاف یہ جنگ اس وقت تک جاری رکھی جائے جب تک ہندوستان کی مقدس سرزمین سے برطانیہ اپنا بوریا بستر لپیٹ نہیں لیتا اس اعلان آزادی پر آزاد ہند کی عبوری حکومت کے تمام اکابرین اور رہنماؤں نے دستخط کئے تھے۔

گواہ نے بتایا کہ آزاد ہند کی عبوری حکومت کو جرمنی، جاپان، اٹلی، تھائی لینڈ، فلپائن، کروشیا، منچوریا، اور برما کی حکومتوں نے تسلیم کر لیا تھا۔ گواہ نے اس الزام سے انکار کیا کہ آزاد ہند فوج میں جبری بھرتی کی جاتی تھی مسٹر ڈیسائی کے جرح کے دوران گواہ نے اعتراف کیا کہ آزاد ہند فوج میں شامل ہونے والے لوگ اپنی مرضی سے شامل ہوتے تھے۔ طاقت یا جبر کا استعمال کبھی نہیں کیا گیا۔ آزاد ہند فوج کی سیکرٹ سروس کے دو گواہ بھی پیش کئے گئے۔ جنہوں نے اس بات کا انکشاف کیا کہ وہ ہندوستان کے فوجی علاقوں میں داخل ہو کر فوجی اہمیت کے راز معلوم کرتے تھے۔ لانس نائیک مہیندر سنگھ نے بتایا کہ اسے ہندوستان میں سبوتاژ کے کاموں کے لئے تربیت دی گئی تھی۔ لیکن جب ان کا لیڈر موہن سنگھ گرفتار ہو گیا تو اس نے انڈین نیشنل آرمی (آزاد ہند فوج) سے قطع تعلق کر لیا۔ استغاثہ کے ایک گواہ حوالدار غلام محمد نے کہا۔ "آزاد ہند فوج کا مقبول نعرہ "دہلی چلو" تھا، بعد میں ایک اور نعرے کا اضافہ کیا گیا۔ "خون۔ خون اور خون"

کیپٹن شاہ نواز نے اپنے بیان میں محمد حسین کے قتل کے الزام سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ آزاد ہند فوج میں شامل ہونے سے قبل میں نے فیصلہ کیا تھا کہ تاج برطانیہ کے لئے میں اپنی زندگی گھر بار، خاندان غرضیکہ ہر چند قربان کر دوں گا۔ میرا ارادہ اتنا پختہ تھا کہ اگر میرے راستے میں میرا بھائی بھی حائل ہوتا میں اس سے بھی لڑتا۔ اور ۱۹۴۴ء میں یہی واقعہ پیش آیا۔ میں اپنے بھائی کے خلاف لڑا جس میں وہ زخمی ہو گیا۔ اس دوران میرے اور اس کے درمیان گھنٹوں بحث ہوتی کہ ہماری وفاداری درحقیقت کس کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ تاج برطانیہ کے ساتھ یا وطن کی سرزمین سے۔ اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میری وفاداری وطن کے ساتھ ہونی چاہیئے اور میں نے نیتاجی سے وعدہ کیا کہ میں تمام زندگی وطن کی آزادی اور بقا کے لئے زندہ رہوں گا۔" کیپٹن شاہنواز نے محمد حسین کے بارے میں بتایا کہ وہ آزاد ہند فوج میں شامل تھا۔ لیکن اس نے دشمن کو راز بتانے کا بدترین جرم کیا۔ جس کی سزا فوجی قواعد و ضوابط کے مطابق موت ہے۔ اسے ایک مرتبہ میرے سامنے پیش کیا گیا تھا مگر میں نے اُسے موت کی سزا نہیں دی تھی، بلکہ بعد میں اُسے کمانڈنگ افسر کے سامنے پیش کیا گیا۔ کیپٹن شاہ نواز نے سبھاش چندر بوس کے بارے میں بتایا کہ ہندوستان میں کبھی ان کی ملاقات نہیں ہوئی۔ ملایا میں ان کی تقریریں سننے کا موقع ملا اور وہ بہت متاثر ہوئے۔ ان کی شخصیت اور ان کی تقریروں میں جادو تھا۔ پہلی بار ہندوستان کو ایک ہندستانی کی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا۔ سبھاش چندر بوس نے جاپانیوں کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ زبردست آدمی تھے۔ ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا۔ آزادی ہر قیمت پر مکمل آزادی
کیپٹن شاہ نواز نے بتایا کہ آزاد ہند فوج میں جبری طریقے سے بھرتی نہیں ہوتی تھی۔ سبھاش چندر بوس نے ہر ایک سے کہہ رکھا تھا کہ اگر وہ آزادی کی راہ میں اپنی بیش قیمت چیز کی قربانی دینے کا حوصلہ نہیں رکھتا تو وہ آزاد ہند فوج کی خدمات سے دست بردار ہو جائے جو لوگ آزاد ہند فوج میں موجود ہیں وہ بھوک، پیاس، جبری مارچ اور موت کے لئے ہمیشہ تیار رہیں

سبھاش چندر بوس کا دوسرا روپ

ضیاء الدین خان

کیپٹن سہگل نے بیان دیتے ہوئے کہا۔ ۱۷ فروری ۱۹۴۲ء کا وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے جب فیرر پارک سنگاپور میں لیفٹیننٹ کرنل ہنٹ نے بھیڑ بکریوں کی طرح بھارتی سپاہیوں اور افسروں کو جاپانیوں کی تحویل میں دے دیا۔ یہ واقعہ میرے خیالات میں عظیم تبدیلی کا موجب بنا۔ یہ ایک شدید ذہنی اور جذباتی جھٹکا تھا جس نے میرے جذبات میں تلاطم پیدا کر دیا۔ جاپانیوں نے ہم جنگی قیدیوں کو آزاد ہند فوج کے جی او سی کیپٹن موہن سنگھ کے حوالے کر دیا۔ ہمیں اس بات کی آزادی دی گئی کہ ہم سوچ کر فیصلہ کریں، میں نے کافی سوچ بچار کے بعد آزاد ہند فوج میں شمولیت اختیار کر لی۔ چار افراد کے قتل کے الزام کی تردید کرتے ہوئے کیپٹن سہگل نے کہا کہ ان چاروں افراد نے آزاد ہند فوج کے اصولوں کی خلاف ورزی کی تھی، اور فوجی قوانین کی روشنی میں انہیں موت کی سزا کا حکم سنایا گیا، مگر اس سزا پر عملدرآمد نہیں کیا گیا۔ ان کے تحریری معافی نامے پر انہیں چھوڑ دیا گیا البتہ ان کی سزا کی خوب تشہیر کرائی گئی تاکہ دوسرے افراد آزاد ہند فوج سے غداری کا خیال دل سے نکال دیں۔

لیفٹیننٹ ڈھیلن نے ان واقعات کو بیان کیا جن کے تحت سنگاپور کو جاپانیوں کے حوالے کیا گیا۔ انہوں نے آزاد ہند فوج کی تاریخ اور کیپٹن موہن سنگھ کے بارے میں بھی بتایا کہ کن حالات میں آزاد ہند فوج کی تشکیل کی گئی۔ اور موہن سنگھ نے کیا خدمات انجام دیں۔ کیپٹن ڈھیلن کا خیال تھا کہ مضبوط آزاد ہند فوج ہی ہندوستان کو آزاد کرا سکتی ہے نیز جاپانیوں سے بھی مزاحمت کر سکتی ہے۔ اس نے اس بات کی سختی سے تردید کی کہ آزاد ہند فوج میں جبری بھرتی ہوتی تھی۔ لوگ اپنی مرضی سے اس میں شامل ہوتے تھے۔ آزاد ہند فوج مشرق بعید میں رہنے والے ہندوستانیوں کی زندگی، جائداد، اور ان کے حقوق کی تحفظ کرتی تھی۔ نیز جنگی قیدیوں کے مال و متاع، کی حفاظت کے ساتھ ان کی ہر قسم کی امداد بھی کرتی تھی۔ اس نے کہا ہم نے اس بات کی برابر جد و جہد کی کہ جاپان شہری علاقوں پر بمباری نہ کرے۔ مشرق بعید کے علاقوں میں رہنے والے ہندوستانیوں نے ہماری خدمات کو سراہا اور ہندوستان کی آزادی کے لئے آزاد ہند کی عبوری حکومت کو کروڑوں روپے کا فنڈ دیا۔

مقدمے کی کارروائی کے دوران سبارو آدہیٹا اور جاپانی حکومت میں خارجہ امور کے نائب وزیر مسٹر شوئیچی ماتسوموٹو کو بھی بطور گواہ پیش کیا گیا۔ وکیل صفائی کی جانب سے سابق جاپانی نائب وزیر برائے خارجہ امور اور مسٹر ترو ہاچیا کو پیش کیا گیا۔ آزاد ہند کی عبوری حکومت کے پبلسٹی اور پروپیگنڈہ وزیر مسٹر ایس اے آئر نے بتایا کہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو آزاد ہند حکومت قائم کی گئی اس کی ممبر شپ ساتھ لاکھ پچاس ہزار تھی لوگ آزاد ہند میں رضا کارانہ شامل ہوتے تھے۔ بنگال کے متاثرین کی امداد کے لئے ایک کروڑ ٹن چاول کی پیشکش کی گئی تھی، اس نے بتایا کہ آزاد ہند کے دو اعلیٰ افسر راش بہاری بوس اور جی او سی، موہن سنگھ کے درمیان جاپان سے تعلقات کی نوعیت پر شدید اختلافات ہو گئے تھے۔

گواہوں کے بیانات مکمل ہونے کے بعد مسٹر ڈیسائی نے طویل اور معرکتہ الآرا تقریر کی جس میں انہوں نے چند اہم دستاویزات اور تاریخی واقعات کے حوالے سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تینوں افراد نے کوئی جرم نہیں کیا، بلکہ عبوری حکومت کے ڈیکلریشن اس بات کا ثبوت ہے کہ آزاد ہند فوج نے ہندوستان کو نجات دلانے کے علاوہ ملایا اور برما میں رہنے والے ہندوستانیوں کی زندگی، جائداد اور ان کے وقار کا تحفظ کیا۔ عبوری حکومت باقاعدہ تقسیم اختیارات کے ساتھ ایک منظم حکومت تھی۔ یہ بات ریکارڈ میں موجود ہے کہ صرف ملایا میں رہنے والے دو لاکھ تین ہزار ہندوستانیوں نے جون ۱۹۴۴ء میں عبوری حکومت سے وفاداری کا اعلان کیا تھا۔ مسٹر ڈیسائی نے دوسرا اہم نکتہ یہ پیش کیا کہ عبوری حکومت کے پاس ایک باقاعدہ فوج تھی جو آزاد ہند فوج ایکٹ کے تحت کام کرتی تھی۔

مسٹر ڈیسائی نے بتایا کہ آزاد ہند کی عبوری حکومت پچاس مربع میل اور پندرہ ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ علاوہ ازیں آزاد ہند فوج نے منی پور اور بیٹن پور کو بھی آزاد کرا لیا تھا جو تقریباً ایک ہزار پانچسو مربع میل پر پھیلے ہوئے تھے۔ آمدنی کے اہم ذرائع کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ ہندوستانی عوام نے عبوری حکومت کو تقریباً ۲۰ کروڑ روپے عطیے کی شکل میں دیئے تھے۔ جس سے فوج اور ریاست کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔ جب آزاد ہند بنک پر قبضہ کیا گیا اس وقت بھی اس میں ۳۵ لاکھ روپے موجود تھے۔ مسٹر ڈیسائی نے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ بیرونی تسلط سے نجات حاصل کرنے کی جد و جہد یا جنگ بین الاقوامی، اور اخلاقی اعتبار سے منصفانہ ہے، اگر ہندوستان کے باشندے بحیثیت سپاہی برطانیہ کی آزادی کے لئے جرمنی، اٹلی اور جاپان سے لڑ سکتے ہیں تو کیا انہیں اس بات کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنی آزادی کے لئے بیرونی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لئے جنگ کریں۔؟ ان کی اس تقریر کا گہرا اثر ہوا مسٹر ڈیسائی نے کہا کہ تینوں افراد پر بغاوت اور ذاتی مقصد کے لئے قتل کرنے کا الزام ثابت نہیں کیا جا سکتا، اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو کیا ان لوگوں پر دفعہ ۳۰۲ کے تحت مقدمہ چلایا جائے گا جنہوں نے آزاد ہند فوج سے جنگ کی اور انہیں قتل کیا۔؟ انہوں نے کہا کہ جنگ کی حالت میں فریقین کی بنیادی ذمہ داری ایک دوسرے کو اقتدار سے محروم کرنا ہوتا ہے۔ عام حالات میں قتل ایک بدترین جرم ہے، لیکن جنگ کی صورت حال میں فرض بن جاتا ہے۔ ایڈوکیٹ جنرل نے آزاد ہند فوج کے تینوں افراد پر یہ الزام عائد کر کے کہ انہوں نے تاج برطانیہ کے خلاف جنگ شروع کی ثابت کر دیا کہ یہ ذاتی معاملہ نہ تھا بلکہ ایک منظم حکومت کی حکمت عملی کا ایک حصہ تھا۔ مسٹر ڈیسائی نے کہا کہ دو مسلح افواج، برطانوی فوج اور آزاد ہند فوج کے درمیان باقاعدہ جنگ ہوئی تھی چنانچہ انڈین پینل کوڈ کی دفعہ ۹، کے تحت ان تینوں افراد پر ملکی قانون کے مطابق مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا۔ انہوں نے اپنے دلائل کے حق میں بین الاقوامی قوانین کے حوالے دیتے ہوئے کہا کہ ملکی قوانین کے تحت ان پر مقدمہ چلانا اور سزا دینا بین الاقوامی قوانین کو توڑنے کے مترادف ہوگا۔

مسٹر ڈیسائی نے آخر میں کہا کہ کیپٹن سہگل اور ان کے سپاہیوں نے ہتھیار رکھنے سے قبل اس بات کا اعلان کیا تھا کہ وہ جنگی قیدی کی حیثیت سے ہتھیار ڈالیں گے یا آخری دم تک جنگ کریں گے۔ اس بات کی گواہی کرنل کشن اور غلام محمد دیں گے۔ ان کی یہ شرط قبول کر لی گئی تھی۔ اس کے بعد کیپٹن سہگل نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بحیثیت جنگی قیدی ان تمام مراعات کے حق دار ہیں جو جنگی قیدیوں کو دی جاتی ہیں۔ لہٰذا کیپٹن سہگل اور دوسرے تمام جنگی قیدیوں کو رہا کیا جائے۔

مسٹر ڈیسائی نے مقدمہ کی تمام کارروائی کو چیلنج کرتے ہوئے غیر قانونی قرار دیا۔

عدالت نے تینوں افراد کو ملزم قرار دے دیا لیفٹیننٹ ڈھیلن اور کیپٹن سہگل کو قتل کے الزام سے بری قرار دیا گیا جبکہ کیپٹن شاہ نواز کو قتل کا ملزم بھی ٹھہرایا گیا۔ کمانڈر انچیف نے تینوں افراد کو عمر قید کی سزا کا حکم سنایا۔

امیرِ جماعتِ اسلامی میاں طفیل محمد کے نام ایک کھلا خط



اسلام پسندی کے دو متضاد معیار کیوں؟

امان اللہ خان

لاہور کے طلبہ کی گرفتاری اور ان پر شاہی قلعے میں ہونے والے مبینہ تشدد کے بارے میں آپ کا بیان پڑھ کر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوا ہوں کہ آج کا عالمِ دین بھی کتنا خود غرض ہے کہ اپنوں اور دوسروں کے لئے دو متضاد معیار رکھتا ہے۔ دراصل علمائے دین اور اسلام پسندوں کی اسی دورخی اور دوغلی پالیسی کی وجہ سے آج کا مسلمان اسلام سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

میری اس گستاخانہ جسارت کا پس منظر یہ ہے کہ گنگا ہائی جیکنگ کیس میں ملوث چھ اور دیگر سینکڑوں حریت پسندوں پر شاہی قلعہ لاہور اور پاکستان کے دیگر عقوبت خانوں میں جس وحشیانہ بربریت کا مظاہرہ مسلسل کئی ماہ تک ہوتا رہا ہم نے اس کی تفصیل سے پاکستان کی تمام سیاسی پارٹیوں کے سربراہوں کو آگاہ کیا تھا اور ان سے استدعا کی تھی کہ وہ اس انسانیت سوز کارروائی کی عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کریں۔ ہمیں اس مراسلے کی وصولی کے بارے میں جماعت اسلامی کے صدر دفتر سے تحریری اطلاع بھی ملی۔ لیکن دنیائے اسلام کی اس سب سے بڑی مملکت میں ایک بھی ایسا شخص نہیں نکلا جو کشمیریوں کے ساتھ ہونے والی اس بربریت کی تحقیقات کرانے کے ہمارے جائز مطالبے کی حمایت کرتا۔ ہم نے آپ لوگوں کو یعنی تمام پارٹیوں کے سربراہوں کو یہ بھی لکھا تھا کہ کشمیری حریت پسندوں پر اذیت ناک جسمانی تشدد کے علاوہ ان کو یہ بھی دھمکیاں دی گئیں کہ اگر انھوں نے پولیس کے مطابق بیان نہیں دیئے تو ان کی بیویوں، بہنوں اور بیٹیوں کو شاہی قلعے میں لا کر ان کی آبروریزی کی جائے گی۔ ہاشم قریشی کی بہن کو تو تھانے بھی لے جایا گیا۔ اس کے باوجود آپ لوگوں کی غیرت نہیں جاگی تو کیا ہم یہ سوچنے میں حق بجانب نہیں کہ یا تو آپ لوگوں کی اسلام پسندی اور انسانیت دوستی کا دعویٰ سیاسی نعرہ بازی کے سوا کچھ نہیں یا پھر آپ لوگ کشمیریوں کو انسان یا مسلمان ہی نہیں سمجھتے۔ آج آپ جاوید ہاشمی پر شاہی قلعے میں ہونے والے مبینہ تشدد کو اچھالتے ہوئے آسمان سر پر اٹھا رہے ہیں۔ آپ کی اسلام پسندی اس وقت کہاں تھی جب اس شاہی قلعے میں کشمیریوں پر آسمان ٹوٹ رہا تھا۔ میں خود بھی ڈیڑھ ماہ شاہی قلعے میں تختۂ مشق بنا رہا۔ میں پندرہ ماہ قید رہا جس میں شاہی قلعے کا ڈیڑھ ماہ بھی شامل ہے۔ آخر پندرہ ماہ کے بعد مجھے غیر مشروط طور پر رہا کیا گیا۔ شاہی قلعے میں جو گزری وہ ناقابلِ بیان ہے۔ چالیس کے قریب بجلی کے جھٹکے مجھے ملنے والی سزا کا ایک چھوٹا سا حصہ تھے۔ اور مجھے ملنے والی اذیت میرے ہم وطنوں کو ملنے والی اذیتوں کے پانچ فیصد کے برابر بھی نہیں۔ اس سے آپ خود اندازہ کریں کہ میرے ہم وطنوں پر کیا گزری ہو گی۔ پھر بھی آپ لوگ خاموش رہیں اور ہماری بار بار کی اپیلوں پر چپ سادھ لیں تو آپ لوگوں کے بارے میں ہمارے کیا تاثرات ہوں گے۔ اس کا اندازہ آپ خود کریں اور اس بات کا فیصلہ بھی خود کریں کہ ہم آپ لوگوں کے بارے میں یہ تاثرات رکھنے میں کس حد تک حق بجانب ہیں۔ معاف کیجئے یہ تاثرات ہمیں صرف آپ کے بارے میں نہیں ان خود ساختہ انسانیت دوست لوگوں کے بارے میں بھی ہیں جو ہر سال اسی شاہی قلعے کے شکار حسن ناصر شہید کا دن تو بڑے دھوم سے مناتے ہیں، لیکن انھوں نے ہمارے مطالبے پر غور کرنا بھی گوارہ نہیں کیا۔

ہمیں تو آپ سے اسی وقت ناامیدی ہوئی تھی جب ہم نے حزبِ اختلاف کے موچی گیٹ والے "تاریخی جلسے" کے دوران آپ سے اور نوابزادہ نصراللہ خاں سے بار بار گزارش کی تھی کہ جلسے میں کشمیریوں پر شاہی قلعے میں کئے جانے والے تشدد کی مذمت کی جائے لیکن نواب صاحب نے آپ کی موجودگی میں صاف انکار کیا اور آپ نے بھی اپنی تقریر میں ہمارے مطالبے کا ذکر تک نہیں کیا۔

میں نے قومی اسمبلی کے اجلاس کے دوران ہر پارٹی کے اہم ممبروں سے تفصیلی گفتگو کی اور انہیں شاہی قلعے کے تشدد سے آگاہ کیا۔ وقتی طور پر تو انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس مسئلے کو مناسب وقت پر اسمبلی میں اٹھائیں گے لیکن جب اسمبلی میں گنگا ہائی جیکنگ کیس زیرِ بحث آیا تو عوامی نمائندوں کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ صرف غوث بخش بزنجو نے تشدد کا سرسری سا ذکر کیا۔ اس کے بعد کراچی میں صحافیوں اور دانشوروں کی طرف سے یومِ دیت نام منایا گیا تو میں نے اپنی تقریر میں شاہی قلعے کی ساری داستان سنائی اور دانشوروں اور صحافیوں سے اپیل کی کہ وہ اس سلسلے میں اپنے قلم کو جنبش دیں۔ لیکن کسی دانشور یا صحافی کا ضمیر اس دردناک کہانی سے بھی نہیں جاگا۔

مولانا صاحب! جن کشمیریوں پر اس وحشیانہ بربریت کا مظاہرہ ہوا ہے، ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جنہوں نے اس وقت تحریکِ پاکستان کے لئے قربانیاں دی ہیں اور جب سے دیتے چلے آ رہے ہیں جب جماعت اسلامی تحریکِ پاکستان کے ہی خلاف تھی۔ ان لوگوں کی قربانیوں بھری سیاسی زندگی آپ کے جاوید ہاشمی کی پوری زندگی سے کہیں زیادہ ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ تحریکِ آزادیٔ کشمیر اور ریاست جموں و کشمیر میں تحریکِ پاکستان نے جنم ہی میر برادران، (میر عبدالقیوم اور میر عبدالمنان جو کئی ماہ تک شاہی قلعے میں ظلم و تشدد کا شکار رہے) کے خاندان میں لیا۔ آج پاکستان کے خود ساختہ دائیں اور بائیں بازو کے لیڈران ہی مجاہدوں کے ساتھ ہونے والے اس وحشیانہ سلوک پر خاموش ہیں — حیف صد حیف۔ بہرحال ہم ان گنے چنے صحافیوں کے شکر گزار ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی شکل میں شاہی قلعے کی دردناک داستانوں کو عوام تک پہنچایا۔

اگر جاوید ہاشمی کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے تو ہم اس کی پُرزور مذمت کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اسلام کے خود ساختہ ٹھیکیداروں اور عوام دوستی کے خود ساختہ دعویداروں کے مردہ ضمیروں پر ماتم کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہم یہ بات بھر

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

پیپلز پارٹی کے ایک سالہ دور میں مزدوروں پر کیا گزری؟

مزدوروں کو کیا مِلا؟

لاٹھی، گولی، آنسو گیس، کال کوٹھڑی

الفتح رپورٹ

۲۰ دسمبر کو پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کا ایک سال پورا ہو گیا۔ اس ایک سال میں وہ کون سی کارروائی ہے جو مزدوروں کے خلاف نہیں کی گئی۔ وہ کون سا اقدام ہے جو محنت کشوں کے خلاف نہیں اٹھایا گیا۔ مزدوروں کا ہر عمل قابلِ تعزیر ٹھہرایا گیا، حق مانگا تو ان کے سینے چھلنی کر دیئے گئے۔ مزدور اپنی تنخواہ لینے گئے۔ تو ان پر بندوقوں کے دہانے کھول دیئے گئے۔ شہید مزدوروں کا جنازہ اٹھانے والوں کا پرندوں کی طرح شکار کھیلا گیا۔ اور ہزاروں کو پابند سلاسل کر دیا گیا۔ مزدوروں اور محنت کش عوام کے کندھوں پر سوار ہو کر برسرِ اقتدار آنے والی پارٹی نے انہیں "غدار، ملک دشمن، بھارت اور روس کا ایجنٹ" کہا، سرکاری ذرائع ابلاغ عامہ نے پروپیگنڈہ کیا کہ "مزدور گھیراؤ اور جلاؤ کر رہے ہیں" یوم عاشورہ پر ریڈیو پاکستان نے ایک مولوی کی تقریر نشر کی، مولوی نے کہا "گھیراؤ اور جلاؤ کرنے والے یزید کے ساتھی ہیں" وزیروں، اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے شور مچایا کہ "ایک غیر ملکی طاقت مزدوروں کو اُکسا رہی ہے ہڑتالیں اور ہنگامے کرنے کے لئے روپیہ دے رہی ہے" یہ الگ بات ہے کہ حکومت نے بعد میں بذاتِ خود اِس الزام کی تردید کر دی اور اعلان کیا کہ مزدوروں کی ہڑتال میں کسی غیر ملکی طاقت کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنے منشور اور انتخابی مہم کے دوران "روٹی، کپڑا اور مکان" کا وعدہ کیا تھا۔ اِسی نعرے نے اس پارٹی کو عوام میں مقبولیت بخشی، پیپلز پارٹی کے چیئرمین نے ۱۱ ستمبر ۱۹۷۱ء کو مزارِ قائدِ اعظم پر خطاب کرتے ہوئے کہا "ظلمت کی سیاہ رات کب تک رہے گی، آؤ اے مزدور اور کسانوں کے بیٹو! ظلم و استحصال کی زنجیریں کاٹ کر وطن آزاد کرائیں" اور جب مزدوروں اور کسانوں کے بیٹوں نے ظلم اور استحصال کے خاتمہ کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا۔ تو پاکستان پیپلز پارٹی کی جاگیردارانہ قیادت نے کھُل کر استحصالی طبقوں کا ساتھ دیا۔ اور بزور طاقت کچلنے کی کوشش کی۔

جب پاکستان پیپلز پارٹی برسرِ اقتدار آئی تو اُس وقت ایک محتاط اندازے کے مطابق صرف کراچی میں دس ہزار مزدور جبریہ بے روزگاری کے شکار تھے۔ تقریباً ۶۶ صنعتی اداروں میں تالہ بندی، چھانٹی یا شفٹیں بند تھیں۔ محنت کشوں نے پیپلز پارٹی کے اربابِ اقتدار کو ان کے وعدے یاد دلائے۔ چنانچہ سابق گورنر سندھ اور موجودہ وزیرِ اعلیٰ ممتاز علی بھٹو نے ۶ جنوری ۱۹۷۲ء کو ایک حکم جاری کیا جس میں کہا گیا کہ ایسے تمام مزدوروں کو جنہیں یکم جنوری ۱۹۷۱ء سے ملازمت سے کسی بھی وجہ سے علیحدہ کیا گیا ہو یا علیحدگی اختیار کی ہو، ملازمت پر بحال کیا جائے۔ بشرطیکہ متعلقہ مزدور کے بقایا جات آجر پر نکلتے ہوں۔ اور جن مزدوروں نے اپنے واجبات وصول کر لئے ہیں انہیں جب ادارے میں کوئی جگہ ہو تو نئی بھرتی کے سلسلے میں فوقیت حاصل ہوگی۔

گورنر سندھ کا یہ حکم تمام برطرف شدہ مزدوروں پر لاگو نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ اس میں صرف یکم جنوری ۱۹۷۱ء سے برطرف ہونے والے مزدوروں کو بحال کرنے کی ہدایت کی گئی۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ مزدوروں کی اکثریت یکم جنوری ۱۹۷۱ء سے قبل برطرف کی گئی تھی۔ دوسرے اس شرط نے کہ "متعلقہ مزدور کے بقایا جات آجر پہ نکلتے ہوں" نے حکم کے دائرے کو اور بھی محدود کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ انتقامی کارروائیوں کے شکار اور مارشل لاء کے تحت سزا پانے والے محنت کشوں کو بھی اس حکم کے دائرے سے باہر رکھا گیا گورنر سندھ کا یہ حکم مزدوروں کی خواہشات اور توقعات کے منافی تھا۔ چنانچہ "الفتح" نے ۲۰-۲۷ جنوری ۱۹۷۲ء (جلد ۲، شمارہ ۳۶) اپنے اداریہ بعنوان "گورنر صاحب! یہ پالیسی نہیں چلے گی" میں واضح طور پر لکھا تھا۔

"بظاہر یہ بڑا دلکش اور عوامی اعلان ہے لیکن حقیقت میں اس کی وقعت کچھ نہیں، اسلئے اس سے برطرف کئے جانے والوں کی واپسی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس کے باوجود بھی تقریباً ۹۵ فیصد مزدور بے روزگار رہیں گے .... گورنر صاحب سے ہماری درخواست اتنی ہے کہ وہ اس اعلان کو واپس لیں تمام مزدوروں کو کام پر واپس لینے کا حکم جاری کریں اور جو مالکان یہ حکم نہ مانیں۔ ان کے کارخانے مزدوروں کو دے دیئے جائیں۔ جنوری ۱۹۷۱ء کی بجائے تاریخ وہ رکھی جائے جو اس بات کا تعین کرے کہ انتخابات کے دوران، اس سے پہلے اور بعد میں کتنی انتقامی کارروائیاں ہوئیں اور پیپلز پارٹی کے کتنے حامیوں کو نشانہ بنایا گیا۔ ایسا نہ ہوا تو یہ بے چینی بڑھتی رہے گی اس کا نقصان سب کو پہنچے گا مزدوروں کو بھی اور حکمرانوں کو بھی"

لیکن ان گذارشات پر دھیان نہیں دیا گیا سرمایہ دار گورنر سندھ کے اس محدود حکم کو بھی ماننے پر رضامند نہ ہوئے۔ سینکڑوں بے روزگار مزدور ایک دفتر سے دوسرے دفتر اور مِلوں کے چکر لگاتے رہے۔ ایک مزدور ملازمت پر بحالی کے کئی کئی احکامات لئے گھومتا رہا۔ لیکن رزق کے دروازے اکثریت پر نہ کھل سکے۔ حکومت نے عوامی نمائندوں پر مشتمل کمیٹیاں بنائیں تاکہ ان کے فیصلوں پر مِل مالکان عمل کریں۔ بہت سے ملوں کی انتظامیہ نے کمیٹیز کے فیصلوں پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اسی دوران مِل مالکان نے عدالتِ عالیہ سے ایسے احکامات پر عملدرآمد

جنازے کے جلوس پر گولیاں چلانے والے، مزدوروں کی غمگساری کا دم بھرتے ہیں

نہ کرنے کے سلسلے میں حکم امتناعی حاصل کر لیا۔

صدر مملکت کے سابق مشیر برائے عوامی امور جناب معراج محمد خان جنوری ۱۹۷۲ء میں کراچی آئے۔ انہوں نے برطرف شدہ مزدوروں کو بحال کرنے کی شب و روز کوشش کی مگر بعض مل مالکان نے اُن کے احکامات پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے کئی مل مالکان کے خلاف مارشل لاء کے تحت کارروائی کرنے کی سفارش کی، لیکن پاکستان پیپلز پارٹی کی جاگیردارانہ قیادت نے اُن کے مشوروں اور سفارشات کو نظر انداز کر دیا۔ سرمایہ داروں نے اسلام آباد ٹیلی گرام دینے شروع کر دیئے کہ معراج محمد خان کو کراچی سے بلا یا جائے۔

جب مزدوروں میں بے چینی زیادہ بڑھی تو حکومت نے مجبوراً مارشل لاء کا ایک ضابطہ نافذ کیا، جس کے تحت ملازمت پر بحالی کے بجائے شکایت پر فیصلے کے لئے ثالث مقرر کئے گئے۔ ثالث کے تقرر کے بعد بہت سے مزدوروں نے درخواستیں پیش کیں۔ اس سے قبل کہ ان درخواستوں پر فیصلے صادر کئے جاتے، ملک سے مارشل لاء ختم کر دیا گیا۔ اور مارشل لاء کے ضابطہ کی قانونی حیثیت بھی ختم ہو گئی۔ جن افراد نے ثالثوں کے سامنے اپنی درخواستیں پیش کیں اُن میں کافی افراد ایسے بھی تھے جن کے مقدمات صنعتی عدالت میں چل رہے تھے، کیونکہ مارشل لاء کے ضابطہ میں یہ شق موجود تھی کہ درخواست دہندہ کی صنعتی عدالت کی کارروائی اس وقت ختم ہو جائے گی جس وقت اس ضابطہ کے تحت ثالث کے روبرو کارروائی شروع ہو گی۔ چنانچہ ایسے مزدور ہوا میں معلق ہو گئے۔ نہ ثالث فیصلہ صادر کر سکتا تھا اور نہ صنعتی عدالت کارروائی جاری رکھنے کی مجاز تھی۔

نئی لیبر پالیسی کا اعلان

صدر بھٹو نے اپنی پہلی نشری تقریر میں مزدوروں کو یقین دلایا کہ کارخانے بند نہیں ہوں گے۔ اور مزدوروں کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی برداشت نہیں ہونے دی جائے گی۔ نئی لیبر پالیسی کا اعلان جلد ہی کر دیا جائے گا، اس کے بعد مرکزی وزیر محنت نے اعلان کیا کہ نئی لیبر پالیسی مزدور رہنماؤں کے صلاح و مشورے سے بنائی جائے گی۔ چنانچہ موصوف نے اس سلسلے میں کراچی کا دورہ بھی کیا۔ قیام کے دوران مزدور رہنماؤں سے ملاقات کی اور لیبر پالیسی پر تبادلۂ خیال کیا۔ انہوں نے مزدور لیڈروں کی طرف سے اٹھائے گئے نکات نوٹ کئے۔ وزیر محنت کے رویے سے یہ تاثر ملتا تھا کہ لیبر پالیسی ابھی زیر تکمیل ہے۔ ایک، ڈیڑھ ماہ تک اس کا اعلان کیا جائے گا۔ لیکن ابھی وزیر محنت کراچی میں ہی تھے، اور مزدور رہنماؤں سے مذاکرات کئے ہوئے تین دن گزرے تھے کہ لیبر پالیسی کا اعلان کر دیا گیا اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ یہ پالیسی بھی افسر نوکر شاہی کی بنائی ہوئی ہے جو گذشتہ ۲۵ برسوں سے سرمایہ داروں کے مفادات کا تحفظ اور مزدوروں کا استحصال کرتی رہی ہے۔

لیبر پالیسی میں مغربی ممالک جرمنی، برطانیہ اور سویڈن کی نقالی کرتے ہوئے شاپ اسٹیوارڈ سسٹم رکھا گیا۔ نورخان کی لیبر پالیسی میں تو ایک ادارے میں کئی یونینوں کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ لیکن پیپلز پارٹی کی لیبر پالیسی میں ایک ہی ملے کے مختلف شعبوں میں یونین بنانے کی اجازت دے کر مزدوروں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی سازش کی گئی۔ اس لیبر پالیسی میں صنعتی تنازعات کو "قابل دست اندازی پولیس" قرار دے کر مزدوروں کو گرفتار کرنے کی اجازت دی گئی۔ کہا گیا کہ سرمایہ دار کا بھی چالان ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ صرف کاغذی باتیں تھیں۔ حقائق سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اس استحصالی نظام میں سرمایہ دار کی گرفتاری ناممکن بات ہے اور بعد کے حالات نے اس اندیشے کو درست ثابت کر دیا۔ کیونکہ مزدور گرفتار کئے گئے اور سرمایہ داروں کو استحصال کی کھلی چھوٹ دی گئی۔

اس لیبر پالیسی نے پاکستان پیپلز پارٹی کی جاگیردارانہ قیادت اور "سوشلزم ہماری معیشت ہے" کا بھرم کھول دیا۔ نئی لیبر پالیسی کا اعلان ہوتے ہی مزدوروں نے مطالبہ کیا کہ اُن کے نمائندوں کے مشورے سے پالیسی میں ترمیم اور رد و بدل کی جائے۔ ۱۲-۱۳ فروری ۱۹۷۲ء کو لاہور میں جوائنٹ لیبر کونسل کا اجلاس ہوا۔ جس میں پاکستان ورکرز فیڈریشن، مزدور رابطہ کونسل، سندھ مزدور فیڈریشن، ویسٹ پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز، پاکستان ٹیکسٹائل لیبر فیڈریشن نے شرکت کی اور اتفاق رائے سے لیبر پالیسی میں ترمیم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ ان کے علاوہ دوسری مزدور تنظیموں نے بھی یہی مطالبہ پیش کیا۔ لیکن حکومت نے مزدوروں کی خواہشات کو نظر انداز کرتے ہوئے من مانی قانون سازی کر ڈالی۔ جو سراسر مزدوروں کے مفادات کے منافی تھی۔ حکومت نے یک طرفہ فیصلہ کر کے ثابت کر دیا کہ اُسے صرف اور صرف سرمایہ داروں کے مفادات عزیز ہیں۔

حکومت کی اس سرد مہری کے باوجود مزدوروں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، ۲۱ مئی ۱۹۷۲ء کو پاکستان ورکرز فیڈریشن، متحدہ مزدور فیڈریشن سندھ، مزدور رابطہ کونسل، سندھ فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز، پاکستان ٹیکسٹائل لیبر یونین، پاکستان ٹریڈ یونینز فیڈریشن نے ایک مشترکہ اجلاس میں نئے مزدور قوانین کے خلاف پُرامن عوامی رابطہ مہم چلانے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ طلباء، وکلاء، ڈاکٹروں، اساتذہ، ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور سیاست دانوں کے سامنے اصل حقائق پیش کئے جائیں۔ اس مقصد کے لئے ۱۲ جون ۱۹۷۲ء کو سندھ ورکرز کنونشن کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن ۷ جون کی فائرنگ کی وجہ سے یہ پروگرام ملتوی کرنا پڑا۔

۷ جون کی مزدور تحریک

۷ جون ۱۹۷۲ء کو فیروز سلطان انڈسٹریز کے مزدور اپنی تنخواہ لینے انتظامیہ کے دفتر میں گئے۔ تنخواہ کے علاوہ منافع کا ۴½ فی صد حصہ بھی اسی دن ملنے والا تھا۔ ملز کی انتظامیہ نے تنخواہ دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ "اس ماہ کی دس تاریخ سے قبل تنخواہیں نہیں دی جا سکتیں" اسی کے ساتھ "لے آف" کا نوٹس لگا دیا گیا۔ بالفاظ دیگر مزدوروں کو کچھ دنوں کے لئے بے روزگار کر دیا گیا۔ مزدوروں نے احتجاج کیا تو سرمایہ داروں کی محافظ پولیس نے ڈی ایس پی نورخان کے حکم پر بغیر وارننگ دیئے مزدوروں پر بندوقوں کے دہانے کھول دیئے۔ ۸ جون کو شہید شعیب کا جنازہ اٹھایا گیا۔ اس دن بھی مزدوروں پر فائرنگ کی گئی، اور سروں اور سینوں کو نشانہ بنایا گیا۔ کراچی کے باشعور مزدوروں نے اپنے اتحاد کا ثبوت دیتے ہوئے مکمل ہڑتال کر دی۔ اس دوران حکومت نے مزدور اتحاد کو توڑنے کے لئے تمام حربے استعمال کئے، پٹھان، پنجابی اور مہاجر کا سوال اٹھایا گیا۔ لیکن مزدوروں نے تمام حربے ناکام بنا دیئے۔ مزدوروں نے مطالبہ کیا کہ فیروز سلطان انڈسٹریز کے مالکان اور ڈی ایس پی پر قتل کے الزام میں مقدمہ چلایا جائے۔ کیونکہ ڈی ایس پی کو فائرنگ کا حکم دینے کا کوئی اختیار نہیں، دوسرے فائرنگ سے قبل وارننگ بھی نہیں دی گئی تھی۔ ڈپٹی کمشنر، ایس ایس پی، صوبائی وزیر محنت کی برطرفی کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ لیکن پیپلز پارٹی کی جاگیردارانہ قیادت نے اسے اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا۔ اور کوشش کی کہ ہڑتال کو طویل کر کے ناکام بنایا جائے۔ لیکن باشعور مزدوروں نے ۱۹ جون کو ہڑتال ختم کرنے کا فیصلہ کر کے حکومت کے منصوبے کو ناکام بنا دیا۔

ڈبلیو پی آئی ڈی سی کے مزدوروں کی تحریک

ڈبلیو پی آئی ڈی سی کھاد فیکٹری ملتان کے مزدوروں نے اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا جب گفت وشنید سے مسئلہ حل نہ ہوا تو ہڑتال کا نوٹس دیا گیا۔ اس پر گورنر پنجاب مصطفےٰ کھر نے دھمکی دی کہ "کھاد فیکٹری ملتان (PUBLIC UTILITY SERVICE) میں آتی ہے۔ اس لئے ہڑتال پر پابندی عائد کی جاتی ہے، اور خلاف ورزی کرنیوالوں کو کچل دیا جائے گا"۔ ڈبلیو پی آئی ڈی سی کے جنرل منیجر لیبر مسٹر بشیر نے دھمکی دی کہ "ہڑتال کر کے دیکھو، کس بل نکال دیں گے"۔ جب حکومت اور انتظامیہ نے گفت وشنید کے تمام دروازے بند کر دیئے تو ۲۲ اگست ۱۹۷۲ء کو ڈبلیو پی آئی ڈی سی کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ کھاد فیکٹری ملتان، سیمنٹ فیکٹری داؤد خیل، کرم کیمیکلز راولپنڈی، کھاد فیکٹری داؤد خیل، پاک ڈائز فیکٹری، پنسیلین فیکٹری داؤد خیل، کھاد فیکٹری جڑانوالہ، وڑچھ مائینز، سٹون کیوری داؤد خیل، اور ہیوی میکینکل کمپلیکس ٹیکسلا کے ہزاروں محنت کشوں نے ہڑتال میں شرکت کی، یہ تحریک ملک گیر تحریک بن گئی ملک بھر کے مزدوروں نے اس جدوجہد کی حمایت کی، کراچی سے متحدہ مزدور فیڈریشن سندھ کے صدر عثمان بلوچ نے اپنے ساتھی کرامت علی کو ملتان بھیجا، عزیز الحسن اور محمد اکرم بھی ملتان پہنچے، حیدرآباد ڈویل پاک سیمنٹ فیکٹری کے مزدور رہنما مظلوم حسین شاہ اور کراچی کے اقبال نیازی داؤد خیل گئے۔ یہ تحریک ۲۲ اگست سے ۱۴ ستمبر تک جاری رہی۔ اور پھر حکومت کی اس یقین دہانی پر ختم کی گئی کہ کسی مزدور کو برطرف نہیں کیا جائے گا اور مقدمات واپس لے لئے جائیں گے، لیکن ہڑتال کے خاتمہ کے فوراً بعد ارباب اقتدار اپنے وعدوں سے منحرف ہو گئے۔ مزدوروں کا معاشی قتل عام شروع کر دیا گیا، سینکڑوں مزدوروں کو برطرف کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ ڈھائی سو مزدوروں پر مختلف دفعات کے تحت مقدمات دائر کئے گئے۔ لیبر یونین کھاد فیکٹری ملتان اور ڈبلیو پی آئی ڈی سی ایمپلائز فیڈریشن پنجاب کے صدر خان محمد نثار ڈی۔ پی۔ آر کے تحت پابند سلاسل ہیں، اور ڈسٹرکٹ جیل ملتان میں انہیں اذیت ناک سزائیں دی جا رہی ہیں۔

کوہ نور ریان ملز کے مزدوروں کی تحریک

اکتوبر ۱۹۷۲ء کے اواخر اور نومبر کے اوائل میں کوہ نور ریان ملز کالا شاہ کاکو کے باشعور اور جیالے مزدوروں پر زبردست ظلم وتشدد کیا۔ مزدور رہنماؤں کو مختلف فرضی مقدمات میں ملوث کیا۔ کوہ نور ریان ملز وہ کارخانہ ہے، جہاں محنت کشوں نے صنعت کو سرکاری تحویل میں لینے کی پالیسی کو حقیقی معنوں میں کامیاب ثابت کیا۔ اور صنعت کاروں کے ملکی معیشت میں بے دخل ہونے کے پروپیگنڈے کو باطل کر دیا۔ مزدوروں نے ملز کی پیداوار کو بڑھایا اور خرید و فروخت اور حساب کتاب کو درست کیا سابق انتظامیہ کی دھاندلیوں کو ختم کر کے ملز کے منافع کو کئی گنا بڑھایا۔ لیکن اس سے خوش ہونے کی بجائے حکومت کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے کوہ نور ریان ملز کے مزدوروں کی کارکردگی کو جو قوم کے لئے ایک نمونہ تھی، اپنے لئے موت کا شگون سمجھا اور ملز میں غنڈوں کا راج قائم کر دیا۔ مزدور رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان تمام اشتعال انگیزیوں کے باوجود مزدوروں نے ایک منٹ کے لئے بھی کام بند نہیں کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت جان بوجھ کر صنعتی امن تباہ کرنا چاہتی تھی۔

لانڈھی کورنگی کی مزدور تحریک۔

لانڈھی کورنگی مزدور تحریک کی ابتداء پاکستان مشین ٹول فیکٹری سے ہوئی۔ پاکستان مشین ٹول فیکٹری وزارت دفاع کے تحت ہے۔ پاکستان مشین ٹول فیکٹری کی انتظامیہ نے مزدوروں کی یونین سے ایک معاہدہ کیا تھا۔ محنت کشوں

مزدوروں کی تحریک کو کچلنے کے لئے ان میں علاقائی تعصب پھیلایا گیا

نے مطالبہ کیا کہ معاہدے پر عمل درآمد کیا جائے۔ لیکن انتظامیہ نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ اور ۸۰ مزدوروں کو گیٹ اسٹاپ کر دیا گیا۔ حالانکہ حکومت نے مزدوروں کو بار ہا یقین دلایا تھا کہ کسی کارخانے میں تالہ بندی نہیں ہوگی۔ لیکن ایک سرکاری کارخانے مشین ٹول فیکٹری میں ۸۰ مزدوروں پر رزق کے دروازے بند کر کے یہ ثابت کر دیا گیا کہ حکومت کے تمام وعدے اور یقین دہانیاں باطل تھیں۔ جب مشین ٹول فیکٹری کی انتظامیہ نے مطالبات تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ تو مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ انتظامیہ نے گفت وشنید کرنے کی بجائے پولیس کی مدد سے ۱۳ ستمبر کو فیکٹری کی تالہ بندی کر دی۔ اور چالیس مزدوروں کو دفعہ ۱۴۴ کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ حالانکہ یہ مزدور اپنی ڈیوٹی ختم کر کے گھروں کو جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ مزدوروں کو ہراساں کرنے کے لئے فیکٹری میں مشین گنیں نصب کر دی گئیں۔ اور ہڑتال کو غیر قانونی قرار دے کر دس مزدور رہنماؤں کے خلاف ڈی پی آر کے تحت وارنٹ گرفتاری جاری کئے گئے۔ مشین ٹول فیکٹری کے چھ مزدور رہنما ڈی پی آر کے تحت گرفتار ہیں۔ ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں۔ اور خیرپور جیل میں ان کے ساتھ انسانیت سوز سلوک برتا جا رہا ہے۔

لانڈھی کورنگی صنعتی علاقے کے مزدوروں نے اپنے طبقاتی شعور اور اتحاد کا ثبوت دیتے ہوئے مشین ٹول فیکٹری کے محنت کشوں کی حمایت میں دو دن کی ہڑتال کی۔ ملز مالکان نے اس مدت کی تنخواہ کاٹ لی۔ انکا مقصد یہ تھا کہ مزدوروں کو پاکستان مشین ٹول فیکٹری کے محنت کشوں کی حمایت کرنے کی سزا دی جائے۔ اور محنت کشوں کے بڑھتے ہوئے اتحاد کو پارہ پارہ کیا جائے۔ لیبر آرگنائزنگ کمیٹی کے رہنماؤں نے ملز مالکان سے ملاقاتیں کیں گفت وشنید کے ذریعے کوشش کی کہ مالکان مزدوروں کو دو دن کی تنخواہ ادا کر دیں۔ لیکن مالکان نے ہٹ دھرمی سے کام لیا۔ وزارت محنت خاموش رہی۔ بلکہ پانچ مزدور رہنماؤں کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے گئے۔ مجبوراً لیبر آرگنائزنگ کمیٹی نے ہڑتال کی تنخواہ کی ادائیگی، گرفتار شدہ مزدوروں کی رہائی اور وارنٹ گرفتاری کی واپسی کے لئے ہر شفٹ میں دو گھنٹے کی علامتی ہڑتال کا فیصلہ کیا۔ حکومت نے گفت وشنید سے مسئلہ طے کرنے کی بجائے بزور طاقت اس تحریک کو کچلنا چاہا۔ چنانچہ ۱۷، ۱۸ اکتوبر کی درمیانی شب کو داؤد اور گل احمد ملز میں پولیس نے فائرنگ کی، آنسو گیس پھینکی اور لاٹھی چارج کیا۔ بلڈوزر سے گیٹ توڑ دیئے گئے۔ چند دنوں کے بعد ریڑھی کے علاقے میں پھر پولیس نے نہتے مزدوروں پر فائرنگ کی۔ اور ظلم و تشدد کا بازار گرم کیا۔ مزدوروں کے لہو سے اپنے ہاتھ رنگے۔ لانڈھی کورنگی کے مزدور رہنماؤں خضر اور ریاض حسین کو ڈی۔ پی۔ آر کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ عزیز الحسن، اقبال نیازی اور اکرم کے وارنٹ گرفتاری ہیں۔ پولیس ان کی گرفتاری کے لئے

مزدور بستیوں پر چھاپے مار رہی ہے۔ گزشتہ دنوں عزیز الحسن کے دو بھائیوں کو گرفتار کیا گیا۔ متحدہ مزدور فیڈریشن کے صدر عثمان بلوچ کو اس تحریک کے دوران ہی ڈی پی۔آر کے تحت گرفتار کر لیا گیا تھا۔ یاور خان، کرامت علی، حبیب اللہ ہزاروی، ڈکا خان بھی ڈی۔پی۔آر کے تحت پابند سلاسل ہیں۔ ولیکا ملز یونین کے صدر فیض اللہ، نائب صدر عبدالخالق اور نوشیرواں کے وارنٹ گرفتاری ہیں۔ پولیس ان کے گھر والوں کو ہراساں کر رہی ہے۔ غرض کہ کراچی کے سینکڑوں مزدور جیلوں میں بند ہیں۔ منگھو پیر اور لانڈھی کورنگی کا صنعتی علاقہ پولیس اسٹیٹ میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

کوٹری مزدور تحریک

مئی ۱۹۷۲ء میں کوٹری کے مزدوروں پر پولیس نے فائرنگ اور لاٹھی چارج کیا۔ اور گرفتاریاں بھی عمل میں آئیں۔ صوبائی وزیر محنت ستار گبول نے ۷ مئی ۷۲ء کو سرکٹ ہاؤس حیدر آباد اور ۱۷ مئی ۷۲ء کو وزیر اعلیٰ سندھ ممتاز علی بھٹو نے مزدوروں کی رہائی، اور مقدمات کے خاتمے کا اعلان کیا۔ لیکن چھ ماہ سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود وعدہ پورا نہیں کیا گیا۔ اس سے سرمایہ داروں کی ہمت افزائی ہوئی۔ اس وقت کوٹری میں امین فیبرکس، اٹلس ٹیکسٹائل، اور ریزٹ اسٹرا بورڈ اور چند دیگر ملوں میں جزوی تخفیف کے ذریعے پیداوار میں کمی اور مزدوروں کو بے روزگار کر دیا گیا ہے۔ حیدر آباد میں فتح ٹیکسٹائل ملز میں آٹھ مزدوروں کو برطرف کر دیا گیا ہے۔ نشاط کیمیکل انڈسٹریز کوٹری میں گذشتہ کئی ماہ سے "لے آف" ہے۔

اس کے علاوہ گدو بیراج کے محنت کشوں نے اپنے مطالبات کے حصول کے لئے جائز جدوجہد چلائی جسے حکومت نے پولیس اور کانسٹیبلری کی مدد سے بزور طاقت کچل دیا۔

اس وقت تقریباً دس ہزار مزدور بے روزگاری کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کے ایک سال میں سات مرتبہ مزدوروں پر فائرنگ کی گئی۔ حکومت کے اس جبر و تشدد نے مزدوروں اور محنت کش عوام کی وہ تمام خوش فہمیاں دور کر دی ہیں۔ جو وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے نعرے "سوشلزم ہماری معیشت ہے" سے وابستہ کر بیٹھے تھے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی مزدور دشمن پالیسیوں نے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں کر دی ہے کہ مزدوروں کو اپنے حق کے لئے سوشلسٹ انقلاب کے لئے، اپنی طاقت، اپنی پارٹی اور اپنی جدوجہد پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔

حکومت تمام حربوں کے باوجود مزدور تحریک کو دبانے میں ناکام رہی ہے۔ مزدور تحریک اور مظلوموں کی جدوجہد کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں دبا سکتی۔ یہی تاریخ کا اٹل فیصلہ ہے۔ کیونکہ سڑکوں کی طاقت عظیم ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کی طاقت عظیم ہے۔ اور یہی طاقت کے سرچشمہ ہیں۔

دربابِ سوشلزم و کمیونزم

صفحہ ۱۲ سے آگے

طبقات اور طبقاتی تقسیم باقی نہیں رہے گی تو انسانوں اور ملکوں کے درمیان تصادم اور جنگ کے اسباب بھی ختم ہو جائیں گے۔ کمیونسٹ نظام میں جبری اداروں SOERCIVE ORGANS یعنی فوج، پولیس اور عدالتوں کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ کمیونسٹ معاشرہ کا انسان اشتراکی نظام اور تصورات کی ترقی کے نتیجہ میں اتنا مہذب ہو جائے گا کہ اُسے ایک اچھا شہری بننے کے لئے جبر اور دباؤ کی ضرورت نہیں رہے گی۔ دوسرے کمیونسٹ معاشرے میں نجی ملکیت کا تصور مفقود ہو جائے گا۔ کیونکہ اشیاء اتنی وافر مقدار میں ہوں گی کہ انہیں نجی ملک بنانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ تکنیکی ترقی کے نتیجہ میں کام کے اوقات بہت کم ہو جائیں گے اور انسان اپنا زیادہ وقت دوسرے انسانوں، گروہوں، طبقات، یا ملکوں سے لڑنے کی بجائے جیسا کہ طبقاتی نظاموں میں ہوتا ہے کائنات اور قدرت کو مسخر کرنے میں صرف کرے گا۔ اس وقت معاشرہ میں تضاد کی شکل طبقات کے درمیان تضاد کی کمی نہیں ہوگی۔

اس وقت صرف ایک تضاد باقی رہے گا، جو انسان اور قدرت (NATURE) کے درمیان ہے جہاں تک نظم و نسق کا تعلق ہے لوگ ذہنی اور روحانی طور پر اتنے ترقی یافتہ ہوں گے کہ اپنے فرائض اور حقوق سے خود بخوبی واقف ہوں گے، صرف ایک پنچایتی قسم کا رضا کارانہ نظم و نسق رائج ہوگا، جس میں معاشرے کے افراد کی اپنی مرضی کو دخل ہو گا ایک ایسے معاشرہ میں مارکس نے لکھا ہے کہ انسانیت اس نعرہ کو اپنا سکے گی۔

"وہ ہر شخص اپنی قابلیت اور صلاحیت کے مطابق کام کرے گا اور ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق معاوضہ حاصل کرے گا۔"

شہر اور دیہات، ذہنی اور جسمانی محنت کا فرق ختم ہو جائے گا

کمیونسٹ معاشرہ سوشلسٹ معاشرہ سے اس حد تک بھی مختلف ہوگا کہ ابتدائی سوشلسٹ معاشرہ میں شہر اور دیہات کا فرق اور ذہنی و جسمانی محنت کا فرق کافی حد تک باقی رہتا ہے۔ لیکن اشتراکی معاشرہ کی ترقی اور پیداواری طاقتوں کے زبردست فروغ کے ساتھ ساتھ یہ فرق کم ہوتا جائے گا تاآنکہ کمیونسٹ معاشرہ میں یہ فرق بالکل ختم ہو جائے گا۔ کمیونسٹ معاشرہ ہمہ جہت ترقی کا معاشرہ ہو گا۔ معاشرہ اور انسانوں کی غیر مساوی ترقی UNEVEN DEVELOPMENT یا یک جہتی ترقی کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور معاشرہ اور اس میں رہنے والے اور کام کرنے والے انسان ہمہ جہتی ترقی کر سکیں گے۔ شہری منصوبہ بندی کا طریقہ بدل جائے گا۔ شہر اور دیہات ترقیاتی منصوبوں اور تکنیک کی ترقی کے نتیجہ میں باہم مدغم ہو جائیں گے، اس طرح کہ دونوں کی اچھی خصوصیات اور فوائد ہر جگہ نصیب ہو سکیں گے۔ اس طرح آج کل یہ تقسیم کہ کچھ لوگ صرف جسمانی محنت ہی کرتے ہیں، اُن کی ذہنی صلاحیتیں ترقی نہیں کر سکتیں۔ اس طرح کچھ دوسرے لوگ صرف ذہنی کام کرتے ہیں اور ان کی جسمانی طاقتیں مقابلتاً ضعیف یا کمزور ہوتی ہیں، لیکن کمیونسٹ معاشرہ کا انسان ذہنی اور جسمانی دونوں اعتبار سے مکمل صحت مند اور ترقی یافتہ انسان ہوگا۔

کیا یہ سب باتیں محض خیالی ہیں۔ اور سہانے خواب ہیں؟ جی نہیں۔ مارکس اور اینگلز کے سائنٹیفک سوشلزم کو اسی لئے سائنسی اور حقیقی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اشتراکی اور اشتمالی تصورات کو رومان اور خواب کی دنیا سے نکال کر حقیقی اور سائنسی شکل عطا کی اور یہ بتایا کہ کائنات اور انسانی معاشرہ میں تغیر اور تبدیلی اور انقلاب کیونکر برپا ہوتے ہیں وہ کون سے قوانین ہیں جو ان تغیرات کا سبب بنتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

حلقۂ قارئینِ الفتح

سالگرہ

عطا بزدار

سنا ہے گذشتہ ماہ کی آخری اور ماہِ رواں کی پہلی "رات" ملک کے "غریبوں" کے اجتماع میں "بڑے چراغ" جلے!

غریب سے حقیقت پوچھی تو جواب ملا۔

"۲۵ برس بھول جاؤ! بیس دسمبر غریب کی "سالگرہ" ہے۔ کیا غریب میں اتنی سکت ہے کہ چراغاں کر سکے۔ ویسے اگر غریب کا خون پسینہ "بڑے چراغوں" نے بطور تیل استعمال کیا ہے تو یہ "بڑوں" کے ہاں کوئی "بڑی بات" نہیں ——— وہاں کوئی غریب نہیں تھا۔ غریب کو تو جسم سے روح کا رابطہ رکھنے میں بھی بڑی اذیتوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے" ———

مفت زمین ملے گی!

"۲۵ پیسے کا جاری کردہ فارم دس روپیہ میں! غریب کے بازوؤں (افرادی قوت) سے کام لیا جائے گا!

"بازو کاٹے جا رہے ہیں"

کوئی فرق نہیں پڑا!

"سال بھر "اعلیٰ سطح" کی باتیں ہوتی رہیں ——— اور "اعلیٰ سطحی" کمیٹیوں کی بھرمار رہی ——— ان میں غریب کہیں نظر نہیں آتے؟"

رشوت نہیں چلے گی!

"نفع بخش کاروبار ہے۔ پھل پھول رہا ہے۔ حکامِ بالا کا ایجاد کردہ "کمیشن سسٹم" پورے آب و تاب سے مستحکم بنیادوں پر قائم ہے"

سفارش اقربا پروری مردہ باد!

"میاں زندہ باد ہے ——— کچھ اور کہتے ہوئے شرم آتی ہے" ———

ٹریکٹر بانٹے جائیں گے!

"بٹورے جا رہے ہیں"

۱۱۴ کے تحت تیرہ سو تھا!

"یہ کوئی حل نہیں"

کوئی عالیجاہ نہیں رہے گا!

"اضافہ ہی ہوا ہے"

افسر شاہی نہیں چلے گی!

"وہی ٹھاٹھ باٹھ ہیں۔ وہی جھوٹے روزنامچے ——— رسائیاں ——— شاہی کے بانٹنے میں کوئی فرق نہیں پڑا"

"وکڑ ہضم ——— پتھر ہضم ——— یہاں تک کہ آدمی تک ہڑپ ——— باقی معمول کے مطابق "کاغذوں" پر سب ٹھیک ہے"

صاف ستھری انتظامیہ ہوگی! "فرعونیت میں کوئی کمی نہیں آئی ——— جن ہاتھوں میں انصاف کو رکھا گیا ہے وہ ہاتھ یا تو فل سوٹ کے "جیبوں" میں ہیں، یا پیچھے کی طرف بندھے ہوئے نظر آتے ہیں"

پیپلز رول ڈیولپمنٹ اسکیم تیار کی گئی ہے اور ایک "اعلیٰ سطحی" بورڈ اس پر عمل کرانے کے لیے قائم کیا گیا ہے!

"لیکن بورڈ میں غریب کا داخلہ گناہ ہے"

ہم غریبوں کے بچوں۔ جوانوں کے ہمدرد ہیں!

"جی ہاں ——— بہت بڑے ہمدرد، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ بہت سے ہمدرد ہوا پھانکتے نظر آتے ہیں۔ کچھ گوشہ نشین ہو گئے ہیں"

انقلاب روز روز نہیں آتا!

"جی ہاں انقلاب یقیناً آیا ہے ——— آیا کیا بلکہ چھا گیا ہے ——— لیکن کیا انقلاب میں صرف محنت و مشقت کرنے کی تلقین کی جاتی ہے ——— لاکھوں انسان ٹھوکریں کھا رہے ہیں انہیں "کام" بھی تو بتاؤ ——— لاکھوں ایکڑ زرعی زمین پانی کے لئے ترس رہی ہے، اس زمین کو سیراب کرنے کیلئے انقلابی تدابیر بھی اختیار کرو ——— کیوں آخر فرسودہ طریقے عمل میں لائے جا رہے ہیں ——— "کاغذوں" کے انبار کیوں لگائے جا رہے ہیں۔ یہ "بندر بانٹ" کیوں ہو رہی ہے"

ستائے ہوئے انسانوں کے دکھوں ہی نے تو وہ طوفان اٹھایا تھا، جس کو انقلاب کا نام دیا گیا۔

دعویدارو ——— ستایا ہوا دکھی انسان اپنے "ہاتھ" سال گرہ کے موقع پر تحفتاً پیش کر رہا ہے۔ کام کے لئے محنت و مشقت کرنے کے لئے۔ بہتر مستقبل کے لئے وعدہ نبھانے کے لئے۔ انقلاب کو آگے بڑھانے کے لئے بھروسہ اور اعتماد کے لئے۔

وعدہ تھا سب سے پہلے غریب کا خیال رکھا جائے گا۔ تو پھر یہاں سندھ میں محکمۂ آب پاشی کے مفلس ترین لیکن سخت محنت کرنے والے ملازمین "بیلدارس" ایک بھرپور سال بعد بھی ان حقوق سے محروم کیوں ہیں، جس کا اعلان کیا گیا۔ بیس پچیس روپیہ بڑھوتی کسی انقلاب کا نام تو نہیں، لیکن اُن دعویداروں کے لئے شرم کی بات ضرور ہے۔

بزمِ "الفتح" کا افتتاح

ہم اپنے قارئین کو بڑی مسرت کے ساتھ یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ ادب و تنقید کو صحیح خطوط پہ جانچنے کے لئے "بزم الفتح" قائم کر دی گئی ہے۔ کراچی شاخ کی جانب سے پندرہ روزہ ادبی و تنقیدی نشستوں کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی نشست اتوار ۲۴ دسمبر ۱۹۷۲ء کو جناب معراج محمد خاں کی زیرِ صدارت ۲۱۳، سیکٹر ۳۷ سی، اسٹریٹ نمبر ۱۳، لانڈھی کالونی میں ہوگی۔ تمام ترقی پسند کارکنوں سے درخواست ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں شرکت کر کے اس سلسلے کو کامیاب بنائیں۔

پروگرام: ———

نظم ——— قمر ساحری

مضمون ——— جمیل احمد ندیم

تاریخ ——— ۲۴ دسمبر

وقت ——— شام ساڑھے چار بجے

مقام: ۲۱۳، سیکٹر ۳۷ سی، اسٹریٹ نمبر ۱۳، لانڈھی کالونی (بس اسٹاپ نمبر ۳)

حکومت سرمایہ داروں سے زرِمبادلہ منگوانے میں ناکام ہوگئی: صفحہ ۶ سے آگے

کو انٹرویو دیتے ہوئے صدر بھٹو نے کہا کہ وہ مجیب کی کمزور حکومت کو تسلیم کرنا نہیں چاہتے۔ اس صورتِ حال سے جماعت اسلامی فائدہ اٹھا رہی ہے۔ جماعت اسلامی کے نمائندوں نے آئینی سمجھوتے، جس میں مشرقی پاکستان کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ دستخط کرکے بنگلہ دیش کے قیام کو تسلیم کرلیا تھا۔ لیکن اب وہ اپنی دکانِ سیاست چمکانے کے لئے "بنگلہ دیش نامنظور تحریک" چلا رہی ہے۔

بھاری صنعتوں کو سرکاری تحویل میں لینے کا اعلان

ابتداء میں پیپلز پارٹی کی حکومت نے سرمایہ داروں پر سختی کی، ۲۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو جنرل حبیب اللہ کو مارشل لاء کے ضابطہ اے کے تحت نظربند کردیا گیا۔ یکم جنوری کو احمد داؤد اور فخرالدین ولیکا کو چھ ماہ کے لئے نظربند کر دیا گیا، ۲۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ۱۹ غیر مستحق کارخانوں کے لائسنس منسوخ کر دیئے گئے۔ اور مرکزی وزیرِ خزانہ ڈاکٹر مبشر نے انکشاف کیا کہ "سابق حکومت نے ساٹھ دس کروڑ روپے کے ناجائز صنعتی لائسنس جاری کئے تھے۔

۲ جنوری ۱۹۷۲ء کو دس صنعتوں کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا۔ ان میں لوہے اور فولاد، دھاتوں کی بنیادی صنعتیں، بھاری انجنیئرنگ کے کارخانے، بجلی کی بھاری صنعتیں، موٹر گاڑیوں کی تیاری اور اسمبل کرنے کے کارخانے، ٹریکٹر پلانٹس اور انہیں اسمبل کرنے کی صنعت، بھاری اور بنیادی کیمیاوی صنعتیں، پیٹرو کیمیکلز انڈسٹری سیمنٹ انڈسٹری اور عوامی استفادے کی صنعتیں بجلی کی پیداوار اور ترسیل گیس اور آئل ریفائنریاں شامل تھیں۔ ان اداروں کی مینجنگ ایجنسیاں توڑ دی گئیں۔ ایڈمنسٹریٹر مقرر کئے گئے۔ لیکن مالکان کو منافع کا مستحق قرار دیا گیا۔ اس اقدام سے محنت کشوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ استحصال کا خاتمہ نہیں ہوسکا۔ استحصال برائے راست ہونے کی بجائے بالواسطہ ہوگیا۔

پھر حکومت نے سرمایہ داروں سے گٹھ جوڑ کرنا شروع کیا رفیق سہگل کو پی آئی اے کا سربراہ بنا دیا گیا۔ اور ادارہ فروغِ سیاحت کی سربراہی اُسے سونپ دی گئی۔ اشرف تابانی کو ایکسپورٹ پروموشن بیورو کا چیئرمین بنا دیا گیا اور لطیف ابراہیم جمال کو صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کا چیئرمین بنایا جارہا ہے۔ حکومت نے کھاد کے کارخانے سرکاری تحویل میں لے لئے تھے لیکن گذشتہ دنوں داؤد کو کھاد کی فیکٹری لگانے کے لئے ۴ کروڑ ڈالر کا صنعتی لائسنس دیا گیا ہے۔ ان اقدامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت آہستہ آہستہ اپنی سابق پالیسی ترک کر رہی ہے۔ اور سرمایہ داروں کو نواز رہی ہے۔

صحافیوں کی بحالی اور صحافت پر پابندی

۳ جنوری کو کراچی کے جلسہ عام میں صدر بھٹو نے پریس پر سے پابندی اٹھانے کا اعلان کیا اور کہا کہ پاکستانی اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن چڑھتے ہوئے سورج کے پجاری ہیں۔ انہوں نے وزیرِ اطلاعات عبدالحفیظ پیرزادہ سے کہا کہ "حکومتی پروپیگنڈہ جلد کیا جائے"، جناب حفیظ پیرزادہ نے اپریل ۱۹۷۰ء کی ہڑتال میں برطرف ہونے والے صحافیوں کو ملازمت پر بحال کرایا۔ صرف چار صحافی ابراہیم جلیس، افضل صدیقی، اجمل دہلوی اور شاہد ہاشمی کی بحالی کے مذاکرات ابھی جاری تھے کہ مولانا کوثر نیازی کو وزیرِ اطلاعات بنا دیا گیا۔ مولانا نے پی۔ایف۔یو۔جے کی متعدد یاددہانیوں کے باوجود اس سلسلے میں کوئی کارروائی نہیں کی۔ شاید انہیں میر خلیل الرحمان کی دوستی تو عزیز ہے لیکن صدر بھٹو کے تحریری وعدہ کا پاس نہیں۔

پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں "پنجاب پنچ" "زندگی" اور "اردو ڈائجسٹ" کے ڈیکلریشن منسوخ کئے گئے۔ ان تینوں جریدوں کے مدیر اور ناشروں کو پابندِ سلاسل کردیا گیا۔ روزنامہ "سن" کراچی کا ڈیکلریشن اور پریس ضبط کیا گیا۔ اور صحافیوں کی طویل جدوجہد اور بھوک ہڑتال کے بعد ڈیکلریشن بحال کیا گیا۔ "نوائے وقت" لاہور "امروز" ملتان" اور "جنگ" پنڈی کو اظہار وجود کے نوٹس جاری کئے گئے۔

پیپلز پارٹی کی قیادت اتنی نازک مزاج ہوگئی ہے کہ وہ تعمیری تنقید بھی برداشت نہیں کرتی۔ حق گوئی جرم بن گئی ہے۔ "الفتح" پر محض اس لئے سرکاری اشتہارات کے دروازے بند کردیئے گئے ہیں کہ وہ اربابِ اقتدار کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتا۔ زہر ہلاہل کو قند نہیں کہتا۔

نئی لیبر پالیسی

۱۰ فروری کو نئی لیبر پالیسی کا اعلان کیا گیا۔ اس میں صنعتی تنازعہ کو "قابل دست اندازی پولیس" قرار دے کر مزدوروں کو گرفتار کرنے کی اجازت دی گئی۔ سرمایہ دار کا بھی چالان ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ صرف کاغذی بات ہے حقائق سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اس سرمایہ داری نظام میں ملز مالکان کبھی گرفتار نہیں ہوتے، پیپلز پارٹی کے دور میں کسی سرمایہ دار کو گرفتار کرکے سزا نہیں دی گئی۔ نئی لیبر پالیسی میں شاپ اسٹیوارڈ سسٹم نافذ کرکے مزدوروں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی سازش کی گئی۔ لیبر پالیسی میں کہا گیا ہے کہ ملز مالک مزدور کے ایک بچے کو تعلیم دلائے گا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملز مالک نے مزدور کو برطرف کردیا تو پھر اس کے بچے کو کون تعلیم دلائے گا۔ غرض کہ نئی لیبر پالیسی نے استحصال پر کوئی ضرب نہیں لگائی۔ تمام پالیسی مزدوروں کے مفادات کے منافی ہے۔ چنانچہ مزدوروں نے اس پالیسی کو مسترد کردیا۔

دوسری جانب گماشتہ سرمایہ داروں کے محافظ عالمی بنک اور کنورشیم نے حکومت پر زور دیا اور شرط لگائی کہ امداد اور قرضے اُسی وقت مل سکتے ہیں جب مزدور اور کسان تحریک کو سختی سے کچل دیا جائے۔ تاکہ سرمایہ کاری کے تحفظ کی ضمانت مل سکے۔ چنانچہ منظم منصوبے کے تحت، ۷ اور ۸ جون کو مزدوروں پر فائرنگ کی گئی۔ کوہ نور رایان ملز، ڈبلیو۔پی۔آئی۔ڈی سی کے مزدوروں کی تحریک، گدو بیراج اور لانڈھی کورنگی کے مزدوروں کی جدوجہد کو بزور طاقت دبانے اور کچلنے کی کوشش کی۔ اور مزدوروں کو "غدار، ملک دشمن اور بھارت اور روس کا ایجنٹ"، کہہ کر عوام سے اُن کا رشتہ ختم کرنے کی سازش کی گئی۔ پیپلز پارٹی کے ان ظالمانہ اقدامات سے اب واضح ہوگیا ہے کہ "سوشلزم ہماری معیشت ہے"، کا نعرہ فریب تھا۔

زرعی اصلاحات

یکم مارچ کو زرعی اصلاحات کا اعلان کیا گیا۔ دوسرے دن اس سلسلے میں عام چھٹی بھی کی گئی۔ کہا گیا تھا کہ یکم جولائی سے اصلاحات پر عمل شروع ہوجائے گا۔ لیکن آج تک عمل نہیں ہوسکا۔ ویسے بھی زرعی اصلاحات سے ہاریوں اور کسانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ نواب مظفر نے جو سندھ کے وڈیرے ہیں، صوبائی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے انکشاف کیا تھا کہ میری زمین پانچ ہزار ایکڑ ہے۔ زرعی اصلاحات کی وجہ سے مجھے صرف ایک یا دو ایکڑ سے دست بردار ہونا پڑے گا۔

خارجہ پالیسی

وزارتِ خارجہ براہِ راست صدر بھٹو کی نگرانی میں ہے۔ ۲۱ دسمبر کو عزیز احمد کو وزارتِ خارجہ کا سیکریٹری جنرل بنایا گیا۔ مسٹر عزیز احمد امریکہ نواز سمجھے جاتے ہیں۔ جب یہ

پہلے سرمایہ داروں سے پنجہ آزمائی — پھر صلح

وزارتِ خارجہ کے سیکریٹری تھے تو انہوں نے سامراج نواز پالیسیاں اختیار کی تھیں۔ اسی وجہ سے جب ان کا بحیثیت سیکریٹری جنرل تقرر کیا گیا، تو عوامی حلقوں نے اس پر حیرت کا اظہار کیا تھا۔

صدر بھٹو نے برسرِ اقتدار آتے ہی مختلف ممالک کے دورے کئے۔ کابل، ایران، چین، روس اور عرب ممالک کے، ان کا دورۂ چین سب سے کامیاب رہا۔ ۳۱ جنوری ۱۹۷۲ء کو وزیرِ اعظم چو این لائی نے پاکستان کو وسیع پیمانے پر فوجی امداد دینے کا اعلان کیا، اور ۲ فروری کو جو پاک چین مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا، اس میں کہا گیا کہ "چین نے پاکستان کو گیارہ کروڑ ڈالر کے قرضوں کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیا ہے، ۲۰ کروڑ ڈالر کے قرضے کی ادائیگی ۲۰ سال کے لئے ملتوی کر دی ہے اور مزید بلا سود قرضوں کی پیش کش کی ہے۔"

صدر بھٹو نے حفیظ پیرزادہ کو شمالی کوریا اور شمالی ویتنام بھیجا۔ اس سے یہ تاثر قائم ہوا کہ پاکستان سامراجی بلاک سے نکل کر سوشلسٹ ممالک سے دوستی کرنا چاہتا ہے لیکن چند دنوں کے بعد ہی صدر بھٹو نے سیٹو اور سینٹو کو از سرِ نو منظم کرنے پر زور دیا اور "نیویارک ٹائمز" کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے امریکہ سے ایک نئے فوجی معاہدہ کرنے کی پیش کش کی۔ لیکن ۱۵ فروری کو امریکی وزیر خارجہ نے ۱۳، پیش کش کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ "امریکی حکومت پاکستان کے ساتھ نئے دفاعی معاہدے کے متعلق بات چیت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی پاکستان کو صرف کمیونسٹ ملکوں کے مقابلے میں امداد دی جائے گی۔"

اس کے باوجود حکومت سامراج نواز خارجہ پالیسی پر کاربند رہی۔ سینٹو کے اجلاس میں شرکت کے لئے ایک مرکزی وزیر کو بھیجا گیا۔ ویت نام میں امریکی جارحیت کے خلاف کراچی کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، طلبہ اور عوام نے مظاہرہ کیا تو اُن پر لاٹھی چارج کیا گیا۔ صدر بھٹو نے اسٹیٹ بینک میں سرمایہ داروں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "مظاہرہ کیوں کرتے ہو۔ امریکہ ہمیں مدد دیتا ہے۔ پی ایل ۴۸۰ کے تحت گندم دیتا ہے۔"

جب ویت نام میں عارضی طور پر جنگ بندی ہو گئی اور امریکہ نے ویت نام سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ تو حکومت نے نہ صرف شمالی ویت نام اور شمالی کوریا کی حکومت کو تسلیم کر لیا، بلکہ سیٹو سے بھی علیحدگی اختیار کر لی۔ سیٹو سے علیحدگی کوئی انقلابی قدم نہیں، مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد پاکستان جنوب مشرقی ایشیا کا حصہ ہی نہیں رہا۔ لہٰذا سیٹو میں شامل رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ دوسری جانب سینٹو میں رہنے پر اصرار کیا جا رہا ہے۔ اور ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد پاکستان نے سینٹو کی بحری مشقوں میں حصہ لیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت بدستور امریکہ کا دم چھلا بنی رہنا چاہتی ہے۔

حکومت نے ابھی پرنس سہانوک کی جلا وطن حکومت کو بھی تسلیم نہیں کیا حالانکہ پیپلز پارٹی کے منشور میں اسے تسلیم کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔

معاہدۂ شملہ

پیپلز پارٹی کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے چیئرمین نے بھارت سے ایک ہزار سال جنگ لڑنے کا اعلان کیا تھا۔ برسرِ اقتدار آنے کے بعد بھی صدر بھٹو نے ۱۳ جنوری کو لاہور میں اعلان کیا تھا کہ "ہم مر جائیں گے لیکن بھارت کی غلامی قبول نہیں کریں گے" لیکن آہستہ آہستہ بھارت سے باعزت سمجھوتے کی باتیں ہونے لگیں۔ آخر کار ۲ جولائی کو شملہ سمجھوتہ وجود میں آیا۔ جس میں فیصلہ کیا گیا کہ مغربی پاکستان کی سرحدوں سے دونوں ملکوں کی فوجیں دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ سے پہلے کی پوزیشن پر واپس آ جائیں گی، کشمیر کی صورت حال کا تصفیہ ہونے تک موجودہ پوزیشن برقرار رہے گی، تنازعات کا تصفیہ طاقت سے نہیں، اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق کیا جائے گا، سمجھوتے پر عمل درآمد ایک ماہ کے بعد شروع ہو گا۔

لیکن اس سمجھوتے پر عمل نہیں ہو سکا کیونکہ بھارت نے بنگلہ دیش تسلیم کرنے کی شرط لگا دی۔ بھارت جانتا ہے کہ جنگی قیدیوں کی واپسی حکومت پاکستان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ چنانچہ وہ جنگی قیدیوں کو رہا نہ کرکے سیاسی فائدے اٹھا رہا ہے۔ تاخوچک کا علاقہ جو فوجی نقطہ نظر سے بہت اہمیت کا حامل ہے، بھارت نے لے لیا ہے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت محض اس ڈر سے کہ اگر اُس نے بھارت کی بات نہیں مانی تو وہ جنگی قیدی واپس نہیں کرے گا، بھارت کے سامنے جھک گئی ہے۔

سندھ میں لسانی تنازعہ

۴ جولائی کو سندھ کی اسمبلی نے سندھی زبان کی تعلیم، فروغ اور استعمال کا بل پاس کیا۔ حزبِ اختلاف اور عوام دشمن عناصر نے اس سے سیاسی فائدہ اٹھایا۔ عوام کو بتایا گیا کہ "اردو کا خاتمہ کیا جا رہا ہے۔ اب اردو بولنے والوں کو ملازمت نہیں ملے گی"، جنگ نے "اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے اٹھے" کے ریورس حاشیے لگائے اور "حریت" نے سرخی جمائی "اردو الوداع"۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ سندھی، مہاجر کا سوال پیدا کرکے عوام کو لڑایا جائے۔ دوسری حکومت اس بل کو پیش کرکے انتہا پسند سندھیوں کی خواہشات کو پورا کرنا چاہتی تھی۔ ۱۱ آزاد ارکین نے جو صوبائی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کی حمایت کرتے ہیں، ممتاز علی بھٹو کو دھمکی دی کہ اگر سندھی زبان کا بل پاس نہ کیا گیا تو وہ حمایت سے دست بردار ہو جائیں گے۔ دوسری جانب سندھ میں طبقاتی شعور بڑھ رہا تھا۔ یکم جولائی کے گزرنے کے بعد ہاریوں نے زمینوں پر قبضہ کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اصغر خاں کی زمینوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور میرپور ساکرو اور دیگر علاقوں میں اراضی پر قبضہ کی مہم شروع ہو چکی تھی چنانچہ اس بل کو پیش کرکے حکومت نے سندھی ہاری کو غیر سندھی مہاجر سے لڑا دیا تھا۔

سات دن تک سندھ میں آگ اور قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا۔ آخر کار صدر بھٹو کو مداخلت کرنی پڑی۔ اور اردو کو ۱۲ سال کے لئے تحفظ دیا گیا۔ اگر ۷، ۸ جون کو مزدوروں پر فائرنگ نہ ہوئی ہوتی تو رجعت پسند عناصر اردو تحریک کو چلانے میں ہرگز کامیاب نہیں ہوتے کیونکہ ۷ جون کی فائرنگ کے بعد پیپلز پارٹی کے حقیقی دست و بازو اور طاقت اربابِ حکومت سے نالاں ہو گئے تھے۔ اس لئے رجعت پسندوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔

مہنگائی

پیپلز پارٹی نے برسرِ اقتدار آتے ہی مہنگائی کو کنٹرول کرنے کے اقدامات کئے تھے۔ چنانچہ ۲۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کو وزارت خزانہ میں اشیائے صرف کے نرخوں پر کنٹرول کے لئے ایک علیحدہ شعبہ قائم کیا گیا۔ لیکن گرانی کی روک تھام نہیں

سرکاری ہاتھوں نے پریس کی آزادی کا — گلا گھونٹ دیا

ہو سکی۔ اشیائے خورد و نوش کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ غریب آدمی دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی سے بھی ترس گیا ہے۔ حکومت تمام اعلانات اور وعدوں کے باوجود مہنگائی ختم کرنے میں قطعی طور پر ناکام رہی ہے۔

ادھر بڑی بڑی تنخواہوں پر بھرتی کی جانے والی وزیروں اور مشیروں کی فوج اشیائے صرف کی قیمتوں کو معمول پر لانے کے بجائے اپنی جھولیاں بھر رہی ہے۔ سماج دشمن عناصر کو کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے۔ لوٹ کھسوٹ اور استحصال کا بازار گرم ہے۔ سرکاری نیم سرکاری محکموں میں رشوت اور اقربا پروری کے پچھلے سارے ریکارڈ ٹوٹ چکے ہیں۔ ٹرسٹ کے اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن اور نشر و اشاعت کے دوسرے ذرائع سے وزیروں کے لمبے چوڑے بیانات کے ذریعہ عوام کو نوید صبح کا پر فریب پیغام دیا جا رہا ہے کہ سب اچھا ہے۔ خوشحالی کے دن قریب ہیں۔ بس میری جان کچھ دیر کی بات ہے۔ اور عوام کا پریشان حال ہجوم اس ایک سال کے دوران اس پیپلز پارٹی کی تلاش میں ہے جس نے ان سے روٹی، کپڑا اور مکان دینے کا وعدہ کیا تھا۔

پاکستان کے محنت کش عوام نے اس امید پر پیپلز پارٹی کی حمایت کی تھی کہ انھیں زندہ رہنے کا حق دیا جائے گا۔ انہیں استحصال سے پاک ایک ایسا معاشرہ دیا جائے گا جس میں مساوات اور برابری کے حقوق ملیں گے۔ لیکن اس کے ایک سال نے ثابت کر دیا کہ پیپلز پارٹی کے ارباب اختیار اپنے تمام وعدوں کو بھول گئے۔ اور لٹے پٹے عوامی قافلے کے پاس جو کچھ بچ گیا ہے، اسے چھیننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ یہ وقت کا اہم تقاضہ ہے کہ پاکستان کے محنت کش عوام پیپلز پارٹی کے ایک سال کا سیاسی جائزہ لیں اور اپنے لئے ایک ایسی راہ نکالیں جس پر چل کر وہ حقیقی معنوں میں سرمایہ داروں، اور جاگیرداروں سے نجات حاصل کر سکیں۔

تصحیح

پچھلے شمارے (۱۴-۲۱ دسمبر ۱۹۷۲ء) میں سفرنامہ چین (۸) کے دوسرے کالم کی پہلی سطر میں "عوام کی خدمت کرو" کی بجائے "نارمن بیتھون کی یاد میں" پڑھا جائے۔ ہم اس سہو کے لئے قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔۔۔۔۔ (ادارہ)

قارئین کہتے ہیں

بنگلہ دیش کے مسئلے پر ریفرنڈم کرایا جائے

لائل پور میں صدر بھٹو کے دیئے گئے حالیہ بیان پر محب وطن پاکستانیوں کو سخت استعجاب کے ساتھ ہی انتہائی گہرا رنج بھی ہوا ہے۔ جناب صدر نے اپنے بیان میں مبینہ طور پر فرمایا ہے کہ "ہمیں بنگلہ دیش" کو ایک الگ مملکت کے طور پر تسلیم کر لینا چاہیئے۔ کیونکہ خود مشرقی پاکستان کے عوام نے "آزادی" حاصل کرنے کے لئے "مکتی باہنی" فوج کی تشکیل کی تھی"۔ انا للہ و انا الیہ راجعون!

اب تک یہ جگر گداز الفاظ ہم اپنے بدترین دشمنوں کے منہ سے سنتے آ رہے تھے۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ ہمیں یہ روز سیاہ بھی دیکھنا پڑے گا جب کہ ہمارے اپنے صدر بھی یہی نعرہ لگا کر ہمارے ہنوز تازہ اور رستے ہوئے زخموں پر نمک پاشی کریں گے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ برطانیہ اور دوسرے مغربی ممالک کے اخبارات جنہوں نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی شرمناک مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور بھارت کے جارحانہ عزائم کی حمایت کی تھی، انہوں نے بھی اس حقیقت کا واشگاف لفظوں میں اعتراف کر لیا ہے کہ "مکتی باہنی" کی تنظیم، ترتیب اور اسلحہ کی فراہمی ہمارے بدترین دشمن بھارت کی رہین منت ہے۔ نیز یہ بات بھی اب واضح ہو چکی ہے کہ "مکتی باہنی" کی افرادی قوت پاکستان دشمن عناصر، بھارتی فوجیوں اور کرائے کے ٹٹوؤں پر مشتمل تھی۔ مشرقی پاکستان کے عوام نے نہ علیحدگی کا مطالبہ کیا تھا نہ ہی اپنے لیڈروں کو اس قسم کا اختیار دیا تھا۔ اب اس حقیقت کو جھٹلانا گویا بھارت کی شرمناک جارحیت کی پردہ پوشی کرنے نیز اس کے موقف کی کھلی تائید کرنے کے مترادف ہے۔

ابھی کل ہی بات ہے ہمارے سر فخر سے تن گئے تھے جب کہ ہمارے صدر نے زمام اقتدار سنبھالنے کے بعد واضح الفاظ میں اعلان فرمایا تھا کہ "بنگلہ دیش" بھارت کی ننگی جارحیت کی پیداوار ہے اور جو ملک بھی اسے تسلیم کرے گا وہ مسلمہ بین الاقوامی اصولوں اور اقوام متحدہ کے منشور کی بے حرمتی کا مرتکب ہو گا۔ لہٰذا پاکستان ایسے تمام ملکوں کے ساتھ سفارتی تعلقات منقطع کرے گا۔ صدر بھٹو نے اپنے اس موقف پر عمل کرتے ہوئے، نیپال، برما و بلغاریہ وغیرہ سے سفارتی تعلقات توڑ دیئے تھے اور اس طرح ایک غیور قوم کے احساسات کی صحیح ترجمانی کرتے ہوئے عالمی برادری میں ایک صحت مند مثال قائم کی تھی۔ مزید انہوں نے بار بار اس بات کا بھی اعادہ کیا تھا کہ وہ کسی بھی صورت میں ملک کی سالمیت، قومی غیرت اور مسلمہ اصولوں کو وقتی مصلحتوں کی قربان گاہ پر بھینٹ نہیں چڑھائیں گے۔ اب لائل پور والے بیان کے بعد آج پوری قوم کے ذہن میں ایک بڑا سوالیہ نشان ابھر رہا ہے، وہ یہ کہ آخر وہ کونسے محرکات و مجبوریاں ہیں جنہوں نے ہمارے صدر کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ انہوں نے اپنے سابقہ اور صحیح موقف سے ہٹ کر ایک ایسی سیاسی زقند لگائی ہے جس سے ہمارے دشمنوں کے مسموم عزائم کی تکمیل ہوتی ہے۔

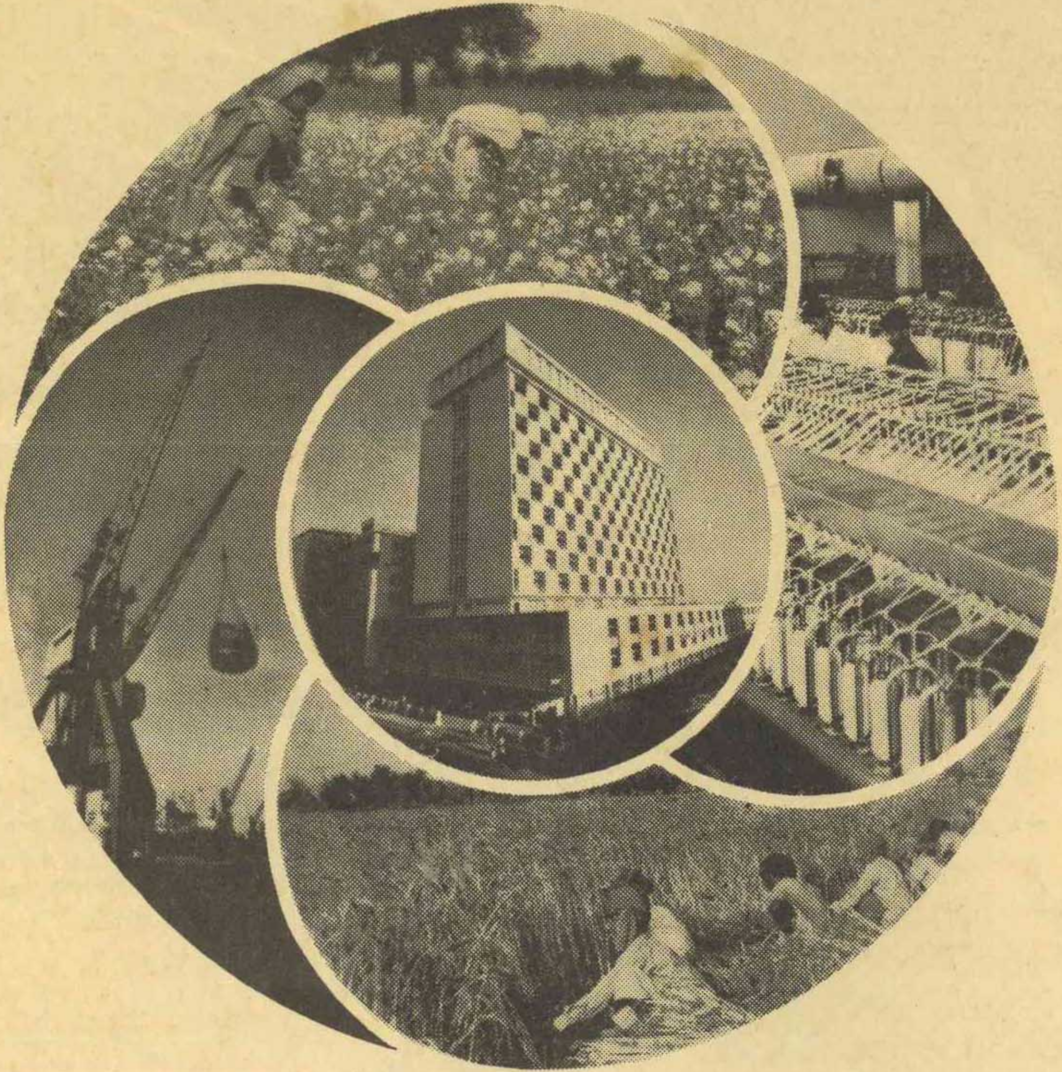
جمہوری ممالک میں اگر حکومت کسی اہم معاملے پر عوام کی رائے معلوم کرنا چاہتی ہے تو اس سوال پر استصواب رائے کرایا جاتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ محض صدر مملکت یک طرفہ جلسوں میں تقریر کر کے حاضرین جلسہ سے ہاتھ اٹھوا کر رائے معلوم کریں۔ کیا یہ صحیح جمہوری طریقہ ہے؟ کیا یہ خفیہ رائے شماری کے مسلمہ اصول کی خلاف ورزی نہیں ہے؟

آخر میں میں صدر بھٹو سے مودبانہ اپیل کروں گا کہ وہ اپنے سابقہ موقف یعنی "عزت کے ساتھ سمجھوتہ" پر مضبوطی کے ساتھ ڈٹے رہیں۔

(رشید اختر قریشی بار ایٹ لا کنوینر یونائیٹڈ پاکستان فرنٹ لندن)

بقیہ: جدوجہد آزادی کے کشمیری مجرم

نہیں بھول سکتے بلکہ ہماری آئندہ نسلیں بھی نہیں بھولیں گی کہ ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس پر کسی سیاسی ٹھیکیدار نے آواز تک نہیں اٹھائی۔ آخر آپ لوگ کس منہ سے کشمیر کے دعویدار بنتے ہیں۔ کشمیر لیکا ؤمال نہیں۔ کشمیریوں کے ساتھ جو سلوک آپ کر رہے ہیں اس کے بعد بھی کشمیر حاصل کرنے کی تمنا آپ لوگوں کو ہی زیب دیتی ہے۔ ہم تو پاکستان کی لیڈر شپ سے خواہ وہ خود ساختہ سوشلسٹ ہوں یا خود ساختہ اسلام پسند، پوری طرح ناامید ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کشمیریوں کو ان کے نام نہاد دوستوں سے بچائے۔ (آمین)۔۔۔۔



اپنی ترقی اپنا بینک

نیشنل بینک آف پاکستان

IAL NBP 6-72

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
21 — 28. DECEMBER. 1972

